مونوگراف

خواجہ حیدر علی آتش

شرف النہار

مونوگراف

خواجہ حیدر علی آتش

شرف النہار

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2019
تعداد : 550
قیمت : -/70 روپے
سلسلہ مطبوعات : 2005

KHWAJA HAIDER ALI AATISH

By: Dr. Sharfun Nihar

ISBN :978-93-87510-58-6

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامنگیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم وکلاسیکی ادب اس تکنیکی تلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں وشاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تا کہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو قلمکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلومات کا ذخیرہ بھی ہو، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تا کہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

ڈاکٹر عقیل احمد
ڈائرکٹر

فہرست

ابتدائیہ	VII
1۔ شخصیت و سوانح	1
2۔ ادبی و تخلیقی سفر	27
3۔ تنقید و تبصرہ	41
4۔ انتخابِ کلام	67

ابتدائیہ

اردو شاعری نے مختلف ادبی دبستانوں کے زیرِ اثر اپنا سفر طے کیا ہے اور ہر دور میں اپنی شناخت اور مزاج کے اثرات کو تسلیم کرایا ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کے پروردہ ایسے ہی ایک اہم شاعر خواجہ حیدر علی آتش ہیں جنھیں اپنے معاصرین کی طرح نہ تو کسی مرتبے کا نشہ رہا اور نہ اس عزت و شان کے متلاشی رہے جو ذلّتوں کے عوض حاصل ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت لکھنوی تہذیب و شائستگی کا ایسا بہترین نمونہ ہے جو طبیعت کی آزادہ روی اور مزاج کی قناعت پسندی کے ساتھ ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر رکھتی تھی۔ کیونکہ وہ جس خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور جن نامور ہستیوں کے زیر سایہ ان کی تربیت ہوئی نیز جو کچھ انھیں ورثے میں ملا وہ تمام اوصاف ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے مزاج کے خمیر کو اٹھانے میں اور بھی بہت کچھ ایسا تھا جو ان کا اپنا تھا۔ جس کا عکس ان کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔

خواجہ آتش نے اپنی شاعری کو گرد و پیش کی حقیقتوں کا آئینہ دار بنایا اور قوی مشاہدہ، عمیق تفکر کے ساتھ رموزِ حیات و کائنات کو شعری پیراہن عطا کیا۔ شاعری کو فکر و فن کی نئی بلندیوں سے ہم کنار کرنے کے لیے ہمیشہ تازہ کاری اور مرصع سازی سے کام لیا۔ نشاطیہ پہلو کو اپنا کر اردو غزل کو

حزن و یاس اور محرومی و نامرادی کے حصار سے نکال کر اسے حسن و عشق کے صحت مند، توانا جذبات کا ترجمان بنایا اور لہجۂ مردانہ سے ہم کنار کیا۔ اگر میر تقی میر نے غم کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر عرفان کی منزل حاصل کی ہے تو آتش نے غم کے سامنے سپر نہ ڈال کر اس جہانِ رنگا رنگ کی سیر میں زندگی کے سنگین کوہساروں سے ٹکرانا سیکھا ہے۔

انہی اوصافِ شعری نے آتش کو ایک ایسا گھنا درخت بنایا جس کی شاخوں پر پرندوں کے مانندان کے تلمیذ چہچہائے اور تازہ دم ہو کر بلند پروازی کی۔ گویا جس طرح انھوں نے شاعرانہ تخلیقی ذہن کے ساتھ شعری تصویروں میں رنگ بھرے اور استاد مصحفی کی روایت کو آگے بڑھایا اسی طرح ان کے شاگردوں نے بھی ان کی طبعی یک رنگی کے ساتھ اپنی شاعری کا سفر طے کیا ہے۔ اس لیے ان کی شخصیت اور شاعری کو اردو شعر و ادب کا وہ قیمتی اثاثہ تصور کرنا چاہیے جو ہست و بود کے ساتھ اپنی موجودگی ثابت کر چکا ہے یعنی آج بھی وہ شعرا کی صف میں کھڑے اپنے وجود کو منوار ہے ہیں اور کل بھی ان کے کلاسکی شعری سرمایہ کی جاذبیت اور رچاؤ، عاشقانِ شاعری کی دلگیریت کا سبب بنے گی۔ کہتے ہیں کہ ایک بلند پایہ شاعر کی یہی پہچان ہے کہ وہ اپنے ہر دور کے ساتھ ہر دور کی آواز بنے اور غالباً آتش کی اسی خاصیت کی بنا پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے انھیں میر، سودا اور غالب کے ہمراہ کھڑا کرتے ہوئے ''پورا شاعر'' کہا ہے۔

دیے گئے خطوط کے مطابق مونوگراف کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب خواجہ آتش کی شخصیت اور سوانح سے عبارت ہے۔ دوسرے باب میں ان کے ادبی اور تخلیقی سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں تنقید و تبصرہ اور چوتھا باب انتخابِ کلام پر مشتمل ہے۔ خواجہ حیدر علی آتش صرف اور صرف غزل کے شاعر ہیں۔ منتخب اشعار ان کی غزلوں سے ماخوذ ہیں۔

اردو زبان و ادب کے مرکزی ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ممنون ہوں کہ اس نے مجھ بے بضاعت کو خواجہ حیدر علی آتش جیسے عظیم شاعر پر مونوگراف تحریر کرنے کی دعوت دی۔ اس میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے۔ میں نے بس اس مشکل کام کو خلوصِ نیت کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کی ہے۔

شرف النہار

شخصیت وسوانح

اٹھارہویں صدی کے شعری منظرنامہ پر ''خواجہ''[1] حیدرعلی آتش کا نام اس معتبر ستارے کی طرح ہے جس نے لکھنوی تہذیب کی لطافتوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اردو غزل کو احساس کی زبان دی اور اس کے نگارخانے کو وسیع کیا۔ نیز اپنی خداداد تخلیقی وفنی صلاحیتوں سے فکر واحساس کی ایک ایسی دنیا خلق کی جو میر و مصحفی کی دنیائے غزل کی توسیع معلوم ہوتی ہے۔ ان کے مخصوص لب و لہجے، رنگ و آہنگ، فقیرانہ وقلندرانہ شان سے عبارت، روحانی ونورانی شاعری میں جذب و سرور اور شوق ونشاط کی دوڑتی ہوئی لہریں، آج بھی انسان کو آدمیت کی شان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تلقین کر رہی ہیں۔

باراں کی طرح لطف و کرم عام کیے جا
آیا ہے جو دنیا میں تو کچھ کام کیے جا

آتش کو والدین کی طرف سے ملا نام خواجہ حیدرعلی تھا اور جب انھوں نے شاعری کی دنیا

1۔ ''خواجہ'' توران میں سادات کا لقب، ہندوستان میں خواجہ یوسف ہمدانیؒ یا خواجہ عبداللہ احرارؒ کی اولاد میں جو لوگ بغداد وغیرہ سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان اور خاص طور پر کشمیر میں آباد ہو گئے ان کا لقب خواجہ تھا۔ خواجہ حیدر علی کا سلسلۂ نسب مصحفی کے بیان کی روشنی میں خواجہ عبداللہ احرار پر منتہی ہوتا ہے اس لیے خواجہ نام کا جزو بن گیا۔

میں قدم رکھا تو آتش تخلّص اختیار کیا جو اتنا مشہور ہوا کہ گویا یہی ان کا نام بن گیا۔ اگرچہ آتش تخلّص دیکھ کر ذہن میں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر انھوں نے اپنے لیے اس طرح کا تخلّص کیوں پسند کیا؟ وہ کون سے اسباب تھے جنھوں نے انھیں آتش تخلّص رکھنے پر اکسایا؟ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ انسان اپنے لیے جو تخلّص تجویز کرتا ہے اس سے اس کی عادت اور مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً مرزا اسد اللہ خاں جب تخلّص غالب کے ساتھ سامنے آئے تو یقیناً ان کو اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہوگا اور ان کے دل میں سب پر چھا جانے کی خواہش ہوگی۔ زندگی پر موت کو ترجیح دینے والے شوکت علی خاں، فانی بن گئے۔ بچپن سے حسن و محبّت کے پرستار رگھوپتی سہارئے کو جب زندگی میں وہ چیز حاصل نہ ہوئی جس کی خواہش تھی تو تخلّص فراق ان کے دلی جذبات و احساسات کے اخراج کا ذریعہ بن گیا۔ شبیر حسین نے اپنی طبیعت کی مناسبت سے جوش تخلّص پسند کیا۔ اردو کے ایک شاعر سعادت یار خاں جو بڑے رنگین مزاج تھے انھوں نے اپنی میلانِ طبع کے زیرِ اثر تخلّص رنگین رکھا۔ لہٰذا خواجہ حیدر علی کے مزاج کے پیشِ نظر اس صداقت پر یقین کرنا لازمی ہو جاتا ہے کہ تخلّص ''آتش'' اختیار کرنے میں ان کی افتادِ طبع کو بڑا دخل رہا ہے۔ بچپن سے ہی مزاج میں گرمی، سرکشی اور جنگ جوئی کا مادہ تھا جو آخری عمر میں بھی برقرار رہا۔ قرابین اور تلوار ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے اس لیے تلوارئے مشہور ہوئے۔

خواجہ حیدر علی آتش کے والد، خواجہ علی بخش دہلی کے باشندے تھے جن کا سلسلۂ نسب خواجہ عبداللہ احرار تک پہنچتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد کا وطن بغداد تھا لیکن تلاشِ معاش کے سلسلے میں ترکِ وطن کر کے دہلی آئے اور یہیں پرانے قلعے میں آباد ہو گئے۔ زندگی گذارتے ہوئے انھوں نے یہاں کی الٹتی بساطوں، سیاسی چالوں اور حیاتِ انسانی کی ارزانیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دہلی کے نامساعد حالات سے حیران و پریشان ہو کر بڑے بڑے فنکار، اہلِ کمال، شاعر و ادیب، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل ہر شخص شہر چھوڑ کر جہاں منھ اٹھا اپنی جان و عزّت کی حفاظت کی خاطر کوچ کر رہا تھا۔ اس عہد کی بدامنی، بے روزگاری، غریبی اور بدحالی کی تصویر کو شعرا کے اشعار اور نثری مقولوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ میر تقی میر نے اپنی کتاب ''ذکرِ میر'' میں لکھا ہے۔ ''دہلی کی حالت بیواؤں سے زیادہ دکھیاری ہے جس کا نہ کوئی سر دھرا ہے اور نہ ولی وارث''۔ وہ اس منظر کو

شعر کی زبان میں یوں بیان کرتے ہیں۔

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

سودا نے دہلی کی تباہی و بربادی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

باغ دلّی میں جو ہوا اک روز میرا گذر
نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار

حالات کی سختیوں نے جب زندگی کو مایوسی ومحرومی کے در پر لا کھڑا کیا تو خواجہ میر درد بھی بے اختیار کہہ اٹھے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

لہٰذا اپنے عہد کی بے سروسامانی کی فضا سے مجبور ہو کر خواجہ حیدرعلی آتش کے والد بھی شہر فیض آباد کے محلّہ مغل پورہ میں آباد ہوئے۔ خانوادۂ عبداللہ احرار سے تعلق ہونے کے سبب ان کی طبیعت کا میلان قناعت پسندی اور استغنا کی طرف تھا۔ محلّہ مغل پورہ میں اقامت پذیر ہونے کے بعد انھوں نے پیری ومریدی کا سلسلہ شروع کیا اور پھر تمام عمر اسی راہ پر کاربند رہ کر زندگی کا گزران کیا۔ گویا یہ سلسلۂ طریقت جہاں ان کی معاشی ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ بنا، وہیں تزکیۂ نفس کا بھی سامان فراہم کیا۔ مغل پورہ اس زمانہ کا وہ مخصوص محلّہ تھا جہاں نواب شجاع الدولہ کی افواج کے مغل سپاہی اور افسران کثیر تعداد میں رہا کرتے تھے۔ لیکن جنگ بکسر کی شکست کے بعد عتابِ شاہ سے تنگ آ کر بیشتر مغل لوگ فیض آباد شاہ جہاں پور کوچ کر گئے تو اس محلّہ میں ہوحق اور ویرانی چھا گئی۔ علی بخش نے اس ویرانی اور نقل مکانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن توکل پر تکیہ کرنے والے، صوفیانہ صفات رکھنے والے اور پیری مریدی کے راستے پر چلنے والے علی بخش ہجرت کرنے والوں کے اصرار پر بھی کہیں نہیں گئے۔ لہٰذا پورب کا یہی شہر خواجہ حیدرعلی آتش کی جائے پیدائش ہے۔ محقق ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اس عہد کے دہلی کے حالات، خواجہ علی بخش کے فیض آباد مقیم ہونے کے حقائق اور آتش کی ولادت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

''یہ وہ دور تھا جب دہلی اُجڑ رہی تھی اور ساتھ ہی ذرائع معاش تیزی سے معدوم ہو رہے تھے۔ جنگ بکسر (1179ھ/ 1765) میں شجاع الدولہ اور مغل افواج کی شکست کے بعد سارا سیاسی، معاشی و معاشرتی منظرنامہ بدل رہا تھا۔ اسی زمانے میں آتش کے والد خواجہ علی بخش دہلی چھوڑ کر فیض آباد آ گئے اور محلّہ مغل پورہ میں آباد ہو گئے اور یہیں خواجہ حیدرعلی آتش پیدا ہوئے۔ آتش فیض آباد اور لکھنؤ میں پیدا ہونے والی اس نسل کے روشن چراغ ہیں جن کے باپ دادا دہلی سے آئے اور وہ خود یہاں پیدا ہوئے۔'' [1]

خواجہ حیدرعلی آتش کی تاریخِ پیدائش کے سلسلے میں اکثر تذکرہ نگاروں کے یہاں اختلاف کی صورت پائی جاتی ہے، کسی نے بھی پیدائش کا دن، مہینہ اور سال کا بیان قطعیت کے ساتھ نہیں لکھا ہے۔ ہاں! تذکرہ ''آبِ بقا'' کے مصنف خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت کے یہاں تعینِ زمانے کے اشارے ضرور ملتے ہیں جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ آتش کی پیدائش غالباً 1770 کے آس پاس ہوئی ہوگی۔ انھوں نے آتش کی پیدائش کو جس پس منظر میں بیان کیا وہ یوں ہے۔

''اسی اثنا میں جنابِ عالی (نواب شجاع الدولہ بہادر) نے اپنے فرزند نواب آصف الدولہ کی شادی نواب خان خاناں کی پوتی سے کی۔ جس میں چوبیس لاکھ روپیہ صرف کیا، یہ واقعہ 1768 کا ہے۔ یہ چہل پہل ہو ہی رہی تھی کہ خواجہ علی بخش کے گھر میں خواجہ حیدرعلی آتش پیدا ہوئے۔'' [2]

مذکورہ بیان سے تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی قریب کا زمانہ قائم کرنے میں تو مدد مل سکتی ہے لیکن کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ خود آتش کی زندگی میں لکھے گئے تذکروں میں بھی ان کی سنہ پیدائش کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ لہٰذا اس تشنگی کا خاتمہ کرتے ہوئے

1۔ تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2007، ص۔720

2۔ آبِ بقا، خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت، نامی پریس لکھنؤ، 1928، ص۔9

جدید دور کے تذکرہ نگاروں 1؎ نے متفقہ طور پر استاد غلام ہمدانی مصحفی کا تذکرہ ''ریاض الفصحا'' کے بیان کو قرینِ قیاس مان کر آتش کی پیدائش 1192ھ/ 1778 کو تسلیم کیا ہے۔ مصحفی نے یہ تذکرہ 1806 میں لکھنا شروع کیا تھا اور 1820 میں مکمل کیا جس میں انھوں نے خواجہ حیدر علی آتش کے احوال، ابتدا ہی میں قلمبند کیے ہیں۔ حروفِ تہجی کے اعتبار سے آتش کا ذکر دوسرے نمبر پر ہے اور بہت ہی صراحت کے ساتھ ان کی عمر 29 برس تحریر فرمائی ہے، چنانچہ آتش کے حالات اور زندگی، خاص طور سے عمر کی تخصیص کے سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر بیان مصحفی کا یوں بھی سمجھنا چاہیے کہ دونوں کے مابین استاد شاگرد کا مقدس رشتہ قائم تھا اور آتش کا شمار ان کے عزیز شاگردوں میں ہوا کرتا ہے۔ اس لیے قوی امکان ہے کہ آتش کی ولادت 1778 میں ہوئی ہوگی۔

آتش شکل و شباہت میں اپنے والد خواجہ علی بخش سے مشابہ تھے۔ وہ گورے چٹے، اجلی رنگت والے پُر وجیہہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا چہرہ، خوب صورت نین نقوش کے سبب بڑا جاذبِ نظر تھا۔ قد دراز، جسم چھریرا، مگر توانا تھا۔ بچپن کا زمانہ ہر فکر سے آزاد اور ہر خطرے سے بے نیاز بڑے چاؤ چوز اور لاڈ و پیار میں گذرا۔ مگر سنِ بلوغ کی منزل میں قدم رکھنے بھی نہ پائے تھے کہ اچانک باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ کوئی سرپرست اور مربّی نہ ہونے کے سبب ان کی تعلیم مکمل نہ ہوئی اور اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے۔ طبیعت نے آزادہ روی پر کچھ یوں اکسایا کہ فوج کے لڑکوں اور سپاہی زادوں کی صحبت میں پڑ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزاج میں بانکپن، سرکشی و جنگ جوئی پیدا ہوگئی۔ واضح ہو کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب اس قسم کی فنی مہارت رکھنے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا مزید یہ کہ مغل بچّوں کی صحبت میں رہ کر انھوں نے فنِ سپہ گری، تیر اندازی، شمشیر زنی میں بھی مہارت حاصل کر لی اور پھر مزاج کی آتش نے یہ انداز اختیار کیا کہ بات بات پر تلوار کھینچ لیتے تھے لہٰذا ان کے اسی رویے نے کمسنی ہی میں انھیں تلوار ئے مشہور کر دیا۔ فیض آباد کے دورانِ قیام کی وضع قطع، عادت و اطوار اور مزاج کے بارے میں تذکرہ نگار خواجہ عبدالرؤف عشرت کا بیان کچھ اس طرح ہے۔

1۔(i) محمد حسین آزاد۔ آبِ حیات (ii) خلیل الرحمٰن اعظمی۔ مقدمۂ کلامِ آتش (iii) شاہ عبدالسلام۔ دبستانِ آتش (iv) پروفیسر وہاب اشرفی۔ تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) (v) ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخِ ادب اُردو (جلد سوم) (vi) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری (vii) شیخ غلام ہمدانی مصحفی۔ ریاض الفصحا۔

''سردی کے زمانے میں شب کو نواب صاحب (محمد تقی خاں ترقی) پنبئی پردے اوڑھ لیتے تھے اور دن کو تنزیب کا انگرکھا پہنے ہوئے اکڑتے پھرتے تھے۔آتش گورے، شکیل، وجیہہ، چھریرا بدن اور رندانہ وضع کے آدمی تھے۔آدھا سر منڈا ہوا اور آدھے سر پر پٹے (اس وقت اچھے بانکوں کی یہی وضع تھی اور ان کو ایک پٹے جوان کہتے تھے) کھانڈا باندھتے تھے۔بھنگیرن کی دکان پر چرس کا دم لگا رہے ہیں۔کسی نے ان کو دیکھ کر کھکارا یا سامنے سے مونچھ اونچی کرتا ہوا نکلا۔بس غضب آ گیا۔تلوار کھینچ لی اور کہا آؤ ہمارے تمھارے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔''[1]

خواجہ حیدر علی آتش کی طبیعت کے مذکورہ ابتدائی نقوش اتنے امٹ رہے کہ انھوں نے تمام عمر اسی سپاہیانہ انداز میں بسر کی۔ یہاں تک کہ بڑھاپے میں بھی تلوار باندھ کر باہر نکلنا زندگی کا شعار بن گیا۔مردانہ وضع قطع اور شان و شوکت کے ساتھ زندگی جیتے ہوئے انھوں نے ہمیشہ عزتِ نفس اور خودی کا تحفظ کیا۔آتش کی مخصوص افتادِ طبع کو دیکھ کر ہی نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے تذکرہ ''گلشنِ بے خار'' میں تحریر کیا کہ ''روش رندانہ وضع بے باکانہ دارد۔'' آتش کے حسب ذیل اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی روش رندانہ اور وضع بے باکانہ کا شاید انھیں خود بھی احساس تھا۔

رند مشرب ہوں مجھ کو کیا ہووے
مذہبوں میں جو اختلاف ہوا

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرف، شیشہ و پیمانہ آج

خواجہ آتش کو باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کا موقع تو نہیں ملا لیکن اس زمانے کے رواج کے مطابق امیروں اور نوابوں کی صحبت میں رہ کر انھوں نے آدابِ مجلس کے ہنر خوب سیکھ لیے تھے۔فیض آباد کے مشہور رئیس، نواب مرزا محمد تقی ترقی، آتش کے سپاہیانہ فن اور شاعرانہ

1۔ آبِ بقا، خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت، نامی پریس لکھنؤ، 1928، ص۔10-9

مزاج سے خاصے متاثر تھے۔آتش نے بھی ان کی صحبتوں سے فیض پایا۔ناسخ کی طرح وہ بھی ان کے یہاں ملازم ہوئے۔ جب غازی الدین حیدر کے عہد میں نواب مرزا محمد تقی ترقی نے فیض آباد کو خیرآباد کہہ کر شہر لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی تو آتش نے بھی وہاں سے کوچ کیا اور لکھنؤ چلے آئے۔لکھنؤ کی دنیا انھیں فیض آباد سے بالکل مختلف نظر آئی۔ یہاں نہ تلواریوں کا زور تھا نہ سپاہی زادوں کی صحبتیں۔گھر گھر شعروسخن کے چرچوں نے آتش کو اس حد تک متاثر کیا کہ طبیعت کا رجحان اب پورے طور پر شعروشاعری کی طرف مائل ہوگیا۔اور اس عہد کے مشہور زمانہ استاد غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ استاد نے بھی آتش کی شعری لیاقت اور علمی بصیرت کا اندازہ لگاتے ہوئے انھیں ہمت افزا کلمات سے نوازہ اور پیشن گوئی کی کہ۔

''حالاں کہ سن عمرش بہ بست و نہ سالگی رسیدہ دریائے طبعش بہ جوش و خروش در زبان نظم ریختہ کہ آنہم درمتانت ورزانت از غزل فارسی کم نسبت کہ بر معاصر نیش سبقت بروجستن وشوارمی نماید۔ اگر عمرش وفا کردہ وچندسال برہمیں وتیرہ رفت وفکر تینش رامالغے درپیش نیاید یکے از بےنظیرانِ روزگارخوایدشدی۔''[1]

آتش کو زبانِ فارسی پر عبور حاصل تھا انھوں نے ''اردو' فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی مگر ان کا فارسی کلام کہیں دستیاب نہیں ہے۔'' البتہ فارسی زبان سے گہری دلچسپی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کے اُستاد مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ

''از ابتدائے موزونی طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی ہر دومی کرد۔اما میلان طبعش بہ طرف فارسی بیشتر بودوآں روز ہا کلام منظوم خودرابہ نظر فقیر می گزرانیدو بہ رافت طبعش ازاں ظہور می داد۔''[2]

تاریخ ادب اردو کے مصنف ڈاکٹر جمیل جالبی کے ذیل بیان سے بھی ان کی فارسی دانی اور علمی قدرشناسی کی یوں تصدیق ہوتی ہے۔

1۔ بحوالہ مقدمۂ کلامِ آتش،خلیل الرحمٰن اعظمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی 2008،ص۔3

2۔ بحوالہ دبستانِ شاعری، شاہ عبدالسلام، مکتبہ جامعہ،نئی دہلی،1977،ص۔48

''گویا ابتدا میں وہ اردو شاعری سے زیادہ فارسی گوئی کی طرف مائل تھے۔
لیکن جب اردو کی طرف آئے تو ایسے آئے کہ پھر فارسی گوئی کو بالکل ہی
ترک کردیا۔ آتش علمِ عروض اور فنِ شعر سے بھی خوب واقف تھے اور علم کی
اہمیت کو بھی خوب جانتے تھے۔''1

ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے کہ والد کے انتقال کے بعد آتش کی تعلیم نامکمل رہ گئی لیکن خواص کی صحبتوں اور خصوصاً لکھنؤ میں شب و روز کی علمی و ادبی محفلوں نے ان میں یہ احساس پیدا کردیا تھا کہ علم ہی وہ شے ہے جو آدمی کو انسان بناتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سند یافتہ نہ ہوتے ہوئے بھی علم کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری اس حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے کہ انھوں نے لکھنؤ کے فرنگی محل کے علمی حلقے سے بھی استفادہ کیا اور علم کی افادیت کو طبقہ جہلا پر واضح کرتے ہوئے تحصیل علم کا درس بھی دیا۔ اس قبیل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام
چھانے ہوئے ہیں کوئے فرنگی محل تمام

افسوس ہے انسان نہ ہو علم کا جویا
وہ مال ہے یہ صرف سے جو کم نہیں ہوتا

چاہے شکست جہل تو تحصیلِ علم کر
وابستہ یہ طلسم ہے لوحِ کتاب کا

''آتش نے اردو شاعری کی ابتدا اُنتیس (29) سال کی عمر میں کی۔'' شاعری میں بھی ان کا خاص میدان غزل ہی رہا۔ غزل انسانی جذبات اور احساسات کے اظہار کا سب سے حسین اور کامیاب وسیلہ ہے کہ جس میں محبت کی زبان میں محبت کی باتیں کی جاتی ہیں۔ اگرچہ غزل کا فن اختصار کا فن ہے لیکن اس کوچے کے مردِ میدان میر، غالب، مومن، درد، انشا اور مصحفی

1۔ تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، 2007، ص۔722

وغیرہ نے اپنی شاعری سے ایک خاص قسم کی تازگی اور شگفتگی کے ساتھ اپنے عصر کے جملہ تقاضوں کو پورا کیا۔ آتش نے بھی اس راہ کا مسافر بن کر ہر قسم کے مضامین کو غزل کی لڑی میں پرویا اور اپنی مہارتِ شعری کا ثبوت دیا۔ لکھنؤ آکر تو طبیعت کا میلان پوری طرح شاعری کی طرف ہی ہوگیا تھا اور اس شعری فضا کی آبیاری میں مصحفی جیسے استاد کے زیرِسایہ مشقِ سخن میں طاق ہوئے تھے مزید یہ کہ جنھیں استاد نے بےنظیرانِ روزگار اور وجیہہ و مہذب الاخلاق جیسے لقب سے نوازا ہو تو اس شاعر کی شاعرانہ صلاحیت اور ذہنی طباعی پر کسے اعتراض ہوسکتا ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جب بادشاہِ وقت کی طرف سے انھیں اسّی (80) روپیہ مہینہ ملتا تھا اور انھوں نے اسی میں قناعت پسندی کے ساتھ رہنا گوارا کیا۔ بعدازاں بقول خواجہ عبدالرؤف عشرت جب انھیں ''ایک ہزار (1000)'' مہینہ ملنے لگا تو زندگی جینے کے لیے گھر بنانا اور گھر بسانا انھوں نے مقدم جانا اور۔

> ''نواز گنج کے قریب چوپٹیوں سے آگے ماہولال کی چڑھائی مشہور ہے۔ وہاں سے اُتار کو ایک چھوٹا سا باغیچہ اور ایک کچّا مکان تھا وہ آتش نے خرید لیا اور اسی میں رہنے لگے۔ مکان لینے کے بعد آتش نے اپنا نکاح کسی شریف خاندان میں کرلیا۔۔۔۔ان کی بیوی بہت نیک عورت تھی۔ ان کی وارستہ مزاجی اور اس کی گرہستی نے مل کر گھر سنبھال لیا۔ عقد سے پہلے تو آتش کو ایک ہزار روپیہ ماہوار ملتا تھا، جب بھی مہینے میں دو ایک فاقے ضرور ہوجاتے تھے۔ لیکن نکاح کے بعد بی بی کے پس انداز کرنے سے میاں فاقہ کشی سے بچ جاتے تھے۔''[1]

اوّل خواجہ آتش کی آمدنی کے بارے میں خواجہ عشرت کا یہ بیان حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ ''ایک ہزار ماہانہ ملنے کے بعد بھی مہینے میں دو ایک فاقے ضرور ہوجاتے تھے۔'' کیونکہ اس زمانے میں یہ رقم کوئی معمولی رقم نہ ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ خواجہ عبدالرؤف عشرت سے ہزار اور سو کے صفر میں کوئی سہو ہوا ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ دیگر تاریخ و تذکرہ نگاروں مثلاً رام بابو سکسینہ، حکیم عبدالحی اور محمد حسین آزاد وغیرہ کے یہاں بھی ماہانہ آمدنی ہزار روپے کا کوئی ذکر نہیں ملتا صرف

1۔ آبِ بقا، خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت، نامی پریس لکھنؤ، 1928، ص۔10

پچاس، اسّی اور سو روپیہ ماہانہ کی بات سامنے آئی ہے۔

قابلِ غور بات ہے کہ کسی بھی تذکرہ نگار نے خواجہ آتش کی اہلیہ کا نام اور ان کے خاندانی حسب ونسب کے بارے میں لب کشائی نہیں کی ہے لہٰذا صرف شریف خاندان اور وصف کفایت شعاری کے بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ خاتون آتش کے مزاج سے واقفیت رکھنے والی، ان کے حکم کی تعمیل کرنے والی اور ان کی غم گساری کرنے والی رہی ہوں گی۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہی ان کے بطن سے ایک بیٹا تولد ہوا جس کا نام والدین نے خواجہ محمد علی رکھا۔ یہ بچّہ اپنے ماں باپ کے خصائص کا مجموعہ تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے والد کی ہمراہی کرتے ہوئے وہ بھی شاعر ہوئے اور جوش تخلّص اختیار کیا۔ آتش کے مذہبی عقائد پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے لکھا ہے کہ وہ ''مذہباً شعیہ تھے اور اثنا عشری فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔'' رضوی کے بیان کی صداقت کو خود آتش کے ایک شعر سے محسوس کیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ

ساغرِ صاف مئے حبِ علیؓ مشرب ہے
مرد مومن ہوں میں اثنا عشری مذہب ہے

کہا جاتا ہے انسان جس ماحول میں جیتا، پرورش پاتا، پروان چڑھتا، وہی ماحول اس کی زندگی کی عمارت کی بنیاد بنتا ہے۔ آتش کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ ان کی شخصیت جس خمیر کا مادہ تھی جن عناصر کا مجموعہ تھی اس میں آزادمنشی، قلندرانہ شان اور فقیرانہ مزاج کو خاص دخل تھا۔ وہ جس خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، جن ہستیوں کے زیرِ سایہ ان کی تربیت ہوئی اور جو کچھ انھیں ورثہ میں ملا ان تمام عناصر کا عکس ان کی شخصیت اور مزاج کا حصّہ بنا۔ بقول ابواللیث صدیقی۔

> ''آتش کا خاندان خود خواجہ زادوں کا خاندان تھا اور مسند فقیروں کے ساتھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی قائم تھا۔ طبیعت میں فقیری غالب تھی، کسی کے دربار سے تعلق پیدا نہیں کیا۔ آزاد کی روایت ہے کہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں، جس پر کچھ چھت، کچھ چھپر سایہ کیے تھا، بوریا بچھا رہتا تھا، اس پر ایک لنگی باندھے صبر و قناعت کے ساتھ بیٹھے رہتے

تھے۔ کوئی متوسط الحال اشراف یا کوئی غریب آتا تو متوجہ ہوکر باتیں بھی
کرتے تھے، امیر آتا تو دھتکار دیتے ۔ وہ سلام کرکے کھڑا ہوتا کہ آپ
فرمائیں تو بیٹھے۔ یہ کہتے، کیوں صاحب بورے کو دیکھتے ہو، کپڑے خراب
ہو جائیں گے، یہ فقیر کا تکیہ ہے، یہاں مسند کہاں ۔ امیر سے غریب
تک اسی فقیرانہ تکیے میں آکر سلام کرتے ۔ اگر روایت میں کچھ مبالغہ بھی
ہو تب بھی اسے تسلیم کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے کہ طبیعت میں قناعت و
استغنا کا مادہ تھا۔''[1]

خواجہ حیدر علی آتش کی زندگی کے احوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں دنیاوی ساز و سامان سے قطعی لگاؤ نہ تھا۔ سادگی سے رہنا پسند کرتے تھے لیکن عزت و ناموس کے ساتھ۔ ان کی بود و باش اور طرزِ خاص کے بارے میں مصنف ''گُلِ رعنا'' اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''وہ (آتش) گیروا تہہ بند باندھتے تھے۔ ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا جس میں ایک
سونے کا چھلاّ لگا رہتا۔ دوسرے تیسرے فاقے کی حالت میں چھلہّ رہن رکھ
کر فاقہ شکنی کرتے ۔ بھنگ پینے کا چسکا زندگی بھر رہا۔ تلی ہوئی مرچوں سے شوق
فرمایا کرتے ۔ بڑے بے طمع اور بے غرض تھے۔ کبھی کسی شاگرد سے اپنی حالت
کا اظہار نہ کرتے تھے ۔۔۔۔ آخری زمانہ میں معالی خاں کی سرائے میں اٹھ
آئے تھے۔ داڑھی بھی بڑھا لی تھی، اس پر مہندی کا خضاب ۔۔۔۔ پاؤں میں
سچے کام کا سلیم شاہی جوتا ایک اشرفی کا پہنتے تھے، مگر وہی رندانہ مزاج، وہی
فقر و فاقہ، ایک ٹوٹے کھٹولے پر بیٹھے رہتے تھے۔ سامنے بجھّا بجھا حقہ لگا رہتا تھا
کوئی امیر و غریب آتا اس کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقہ پیش کیا جاتا۔ گویا متوکل
آدمی تھے۔ دنیاوی ساز و سامان سے انھیں چنداں طمع نہ تھی۔''[2]

آتش کی تمام عمر اسی رنگ میں بسر ہوئی۔ انھوں نے کبھی کل کی فکر نہ کی۔ تنگ دستی میں

1۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جلد دوم، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، 2008، ص۔ 172
2۔ دبستانِ آتش، شاہ عبدالسلام، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 1977، ص۔ 49

کسی کا احسان لینا پسند نہ کیا۔ صبر وشکر اور قناعت پسندی مزاج کا حصّہ تھی اور توکل ایمان کی علامت۔ ان کے فقر وقناعت کا یہ عالم تھا کہ جس روز گھر میں فاقہ ہوتا وہ کسی سے ملنا گوارہ نہ کرتے۔ اگر ایسی حالت میں کوئی مصاحب احسان کرنا چاہتا تو یہ انھیں منظور نہ ہوتا۔ خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت نے ایک واقعہ کے ذریعہ ان کے انہی اوصاف اور مزاج کی کیفیت پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

> ''وارث علی خاں ان کے رفیق بھنگ گھوٹ کر پلایا کرتے تھے۔ مزاج میں توکل تھا۔ جو کچھ آتا اس کو اسی روز خرچ کر ڈالتے تھے۔ دوسرے روز کے لیے کچھ نہ رکھتے تھے۔ جس روز فاقہ ہوتا دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھے رہتے۔ ایک روز رسالہ دار فقیر محمد گویا کو معلوم ہوا کہ آتش آج کل بہت تکلیف میں ہیں۔ کچھ روپیہ لے کر گھر پر آئے۔ دروازہ بند تھا۔ آواز آئی کون ہے؟ یہ بولے فقیر۔ آتش نے کہا کہ فقیر کا میرے یہاں کام نہیں آج خدا مہمان ہے (فاقہ ہے)۔ دوسرے روز پھر آئے مشکل سے دروازہ کھولا۔ ان کا لڑکا بہت کمسن تھا۔ کوٹھے پر کنکوا اُڑا رہا تھا۔ سامنے بلایا اور اس کا کنکوا، چرخی، ڈور دیکھ کر کہا۔ یہ کنکوا تو اچھا نہیں ہے۔ کنّی لیتا ہوگا، ڈور بھی اچھی نہیں سُتّی ہے۔ دو ہزار کی دو تھیلیاں سامنے رکھوا دیں، لو بھئی اس کا ڈور کنکوا منگانا۔ آتش اس بات کی تہہ کو پہنچ گئے کہ خاں صاحب مجھ کو زیر بارِ احسان کرنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے خاں صاحب آپ کو چاہیے تھا کہ اس کو تادیب دیتے کہ ایسے اشغال سے باز رہنا، نہ کہ آپ خود ڈور کنکوے سے مدد دیں۔ یہ کہہ کر پانچ روپے نکال کر لڑکے کو دیئے اور کہا خاں صاحب کو سلام کر و اس کی چیز کھانا۔ باقی روپے خاں صاحب کے واپس کر دیئے۔''[1]

اس بیان کے علاوہ آتش کے انہی شخصی اوصاف (یعنی بے نیازی، سیر چشمی، فقیرانہ اور درویشانہ صفات) کی پرچھائیاں ان کے کلام میں بھی باآسانی تلاش کی جاسکتی ہیں۔

1۔ بحوالہ آتش: عہد اور شاعری، ڈاکٹر محمد حیات الدین، کتابی دنیا دہلی، 2013، ص۔122۔121

چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مرد درویش ہوں تکیہ ہے توکل میرا
خرد ہر روز ہے یاں آمدِ بالائی کا

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

چھوڑ کر ہم نے امیری' کی فقیری اختیار
بوریے پر بیٹھے ہیں' قالیں کو ٹھوکر مار کر

کام رہنے کا نہیں بند اپنا
بندہ پرور ہے خداوند اپنا

ادب نثری ہو یا شعری' اپنے خالق کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے کیونکہ فن پارے میں فنکار کی ذات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے نشیب وفراز' ہمواریوں اور ناہمواریوں' مایوسیوں اور خوشیوں کے تجربات' محسوسات اور مشاہدات کو اپنی فکر ونظر کی خراد پر چڑھا کر تخلیق کے عمل سے گذارتا ہے یہاں اس کی مخصوص افتادِ طبع کام کرتی ہے۔ اس سلسلے میں میر وغالب' دردو مومن کے ساتھ ناسخ وآتش کے اشعار ہماری راہ نمائی کرتے ہیں۔ ان شعرا کے یہاں اپنے عہد کی ترجمانی کے ساتھ اپنے شخصی مزاج' طرزِ زندگی' خیال ونظر' علمی صلاحیت اور لب و لہجے کی گہری چھاپ کے طفیل یہ کہنا لازم ہوجاتا ہے کہ'' ہم تو آواز سے پہچان لیں ان کو۔'' گویا کہنا یہ ہے کہ ہر شاعر اپنے ماحول کا پروردہ ہونے کے باوجود تخلیقی سطح پر اپنے فنی امتیازات سے پہچانا جاتا ہے۔ اس صداقت کو دیکھنے کے لیے ناسخ وآتش کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ۔

'' ناسخ وآتش ایک ہی ماحول ایک ہی زمانہ اور ایک ہی سرزمین کی پیداوار تھے مگر دونوں کی افتادِ طبع اور شاعری میں زمین وآسمان کا فرق

ہے۔ دونوں ایک ہی دبستان کے استاد ہوتے ہوئے بھی بہت مختلف نظر آتے ہیں۔''[1]

جب کہ دونوں، شہر فیض آباد میں نواب محمد تقی کے یہاں ملازم تھے اور لکھنؤ کی سرزمین پر بھی ایک مہاجر یا مہمان کی حیثیت سے دونوں کے وارد ہونے کا زمانہ غالباً ایک ہے۔ گویا ایک زمانہ ایک ماحول ایک ہی میدان کے مردِ مجاہد ہونے باوجود دونوں عادتاً اور فطرتاً الگ تھے۔ ناسخ کے مزاج میں زمانہ سازی تھی۔ وہ لوگوں کی عزت ان کے مرتبے کے لحاظ سے کیا کرتے تھے۔ امیروں کو زیادہ دل کے قریب رکھتے تھے اس وجہ سے ان کے شاگردوں میں رئیس زادے زیادہ تھے۔ انھوں نے اپنے اس برتاؤ سے اس عہد کی سوسائٹی میں اتنا اثر ورسوخ پیدا کرلیا تھا کہ جو شاگرد غریب ہوتا اس کی سفارش کر کے اسے نوکری دلوا دیتے تھے۔ دنیا ساز آدمی تھے۔ لوگ ان کی طرف زیادہ رجوع ہونے لگے یہاں تک کہ جب نواب معتمد الدولہ بہادر نے ان کی شاگردی قبول کی تو ملک میں ان کا رتبہ اور وقار اور بھی بلند ہو گیا۔

خواجہ حیدر علی آتش کا مزاج ان سے جداگانہ تھا۔ فقیری و درویشی صفات رکھنے والے آتش نے کسی کے درِ دولت پر دستک دینا کسرِ شان جانا۔ اگرچہ فکر سخن کے اعتبار سے دونوں اپنے عہد کے بڑے شاعر تھے اس لیے معاصرانہ رشک و رقابت عین مقتضائے فطرت تھی۔ آتش کبھی انسانیت سے نہیں گرے۔ اپنی فقیری پر ہمیشہ قانع رہنا پسند کرتے ہیں۔ اکثر ناقدین، خصوصاً محمد حسین آزاد نے فرضی واقعات کے سہارے آتش و ناسخ کی شعری معرکہ آرائیوں کو ایسے حریفانہ اشاروں کے ساتھ تذکرہ'' آبِ حیات'' میں بیان کیا ہے کہ قاری حکایت کو حقیقت سمجھ کر ایمان لے آتا ہے۔ آزاد کا بیان کردہ ایک واقعہ دیکھئے جسے دونوں کی چشمک کا نقطۂ عروج سمجھنا غلط نہ ہوگا۔

''ایک نواب صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا۔ وہ ان کے معتقد تھے۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ شیخ صاحب جب غزل پڑھ چکیں تو اُنھیں سرِ مشاعرہ خلعت دیں۔ یار لوگوں نے خواجہ صاحب کے پاس مصرع طرح

1۔ دبستانِ آتش، شاہ عبدالسلام، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 1977، ص۔58

نہ بھیجا۔ انھیں اس وقت مصرع پہنچا جب ایک دن مشاعرہ میں باقی تھا' خواجہ صاحب بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اب لکھنؤ رہنے کا مقام نہیں۔ ہم نہ رہیں گے۔ شاگرد جمع ہوئے اور کہا کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں نیاز مند حاضر ہیں۔ دو دو شعر کہیں تو صدہا شعر ہو جائیں گے۔ وہ بہت تند مزاج تھے۔ ان سے بھی ویسی تقریریں کرتے رہے۔ شہر کے باہر چلے گئے۔ پھرتے پھرتے ایک مسجد میں جا بیٹھے' وہاں سے غزل کہہ کر لائے اور مشاعرے میں گئے تو ایک قرابین بھی بھر کر لے کر گئے۔ بیٹھے بھی ایسے موقع پر کہ عین مقابل شیخ صاحب کے تھے۔ اوّل تو آپ کا انداز ہی بانکے سپاہیوں کا تھا اس پر قرابین بھری سامنے رکھی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہیں۔ بار بار قرابین اٹھاتے اور رکھ دیتے تھے۔ جب شمع سامنے آئی تو سنبھل کر بیٹھے اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کر کے غزل پڑھی۔ ساری غزل میں کہیں ان کے لے پالک ہونے پر' کہیں ذخیرۂ دولت پر' کہیں ان کے سامانِ امارت پر غرض کچھ نہ کچھ چوٹیں کیں اور شیخ صاحب بے چارے دم بخود بیٹھے رہے۔''[1]

آزاد کے بیان کے پس منظر میں مذکورہ غزل کا مطلع و مقطع ملاحظہ کیجیے۔

سن تو سہی جہاں میں ہے ترا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

آزاد نے مشاعرے کی محفل کو داستانوی رنگ دے کر ایک ایسے جنگی اکھاڑے کے طور پر پیش کیا ہے کہ جہاں شاید دونوں دو دو ہاتھ کرنے آئے ہوں۔ رہی غزل کی بات تو دو ایک

1۔ اردو کے ادبی معرکے' ڈاکٹر محمد یعقوب عامر' ترقی اردو بیورو نئی دہلی' 1982' ص۔124-123

شعر ایسے ضرور ہیں جن سے طنزیہ فکر ظاہر ہوتی ہے۔ صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو پوری غزل خود آتش کی دل شکستگی اور جراحت کی آئینہ دار ہے۔ خواجہ آتش کے دل میں شیخ ناسخ کے لیے جذبۂ رقابت ہوتو ہو لیکن اس حد تک گر جانا کہ قرابین کی دھمکیاں دینا آتش کے کردار سے بعید از قیاس ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی کوئی ہجو بھی نہیں لکھی۔ ''جلوۂ خضر'' کے مصنف صفیر بلگرامی نے اس بات پر تو اظہارِ افتخار کیا ہے کہ ''ہجو کی رسم تو شعرائے ماسبق خصوصاً میر و مرزا کے زمانے میں علی العلوم جاری تھی۔ اس کی بیخ کنی ایسی کی کہ اب اس کا درخت ابدالاباد تک نہ اُگے گا۔'' جہاں تک ناسخ کا سوال ہے وہ ہمیشہ اپنے شاگردوں کو دوسروں کے شعر پر اعتراض کرنے سے منع کرتے تھے کیونکہ ان کے خاندان میں اعتراض کرنا ممنوع تھا۔ بہر حال خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت کے ذیل بیان سے دونوں کی درمیانی محبت اور رقابت کو محسوس کیجیے کہ جب آتش نے۔

> ''شیخ ناسخ کے مرنے کی خبر سنی تو چیخ مار کر رونے لگے۔ لوگوں نے کہا وہ تو آپ کے پیٹتی تھے۔ ہمیشہ سے دشمنی چلی آتی تھی۔ آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ ایک دشمن کم ہو گیا۔ کہنے لگے میاں کیا کہتے ہو۔ ہم اور وہ فیض آباد میں مدتوں ایک رئیس کے نوکر رہے۔ مدت تک ہم پیالہ و نوالہ رہے، ہمیشہ دوستی کا برتاؤ رہا۔ شاعرانہ نوک جھوک کی اور بات ہے اور اتنا پرانا دشمن بھی نہیں ملتا۔''[1]

خواجہ آتش کی افتادِ طبع کو ان کی شاعری میں کافی دخل ہے۔ ان کے سوانحی حالات اور اعجاز سخن کا مطالعہ باور کراتا ہے کہ آتش صوفی مشرب انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کی روش پر درویشی کے ساتھ جینا پسند کیا تھا۔ آتش کی قلندرانہ طبیعت کی جو جھلکیاں ان کی شاعری میں ملتی ہیں وہ انھیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہیں۔ آتش کا زندگی سے پیار اور زندگی سے لگاؤ ہی وہ انسانی رویہ ہے جہاں ادنیٰ و اعلیٰ کی قید کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ان کے مزاج میں رحم دلی اور انسانیت نوازی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ محبت ان کا ایمان تھا۔ تذکرہ ''جلوۂ خضر'' میں محمد رضا سیاح بلگرامی کے حوالے سے صفیر بلگرامی نے تحریر کیا ہے کہ۔

1۔ آتش: عہد اور شاعری، ڈاکٹر محمد حیات الدین، کتابی دنیا دہلی، 2013، ص۔124

''آتش کو کبوتروں کا بہت شوق تھا' جس حجرے میں رہتے تھے اس میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا وہ بھی جھلنگا۔ بوریا کا فرش تھا اور دیواروں میں کبوتروں کے خانے' جب خود آتش وہاں آکر بیٹھتے تو کبوتر اُڑ اُڑ کر سر اور گردن پر آبیٹھتے' اور یہ خوش ہوتے۔ امیر زادے بھی آتے تو اسی بوریے پر بیٹھتے۔ استغنا کا یہ حال تھا کہ بادشاہ نے کئی بار بلوایا مگر نہ گئے۔''[1]

آتش کے مزاج کی بے نیازی اور زیست کی وضع داری کی ایک مثال یوں بھی سامنے آئی ہے کہ جب ان کے مربی و مددگار نواب محمد تقی خان بہادر کا انتقال ہوا تو آتش کے گذران کا کوئی مستقل ذریعہ نہ رہا۔ اگرچہ ان کے معاصر ناسخ نے نواب معتمدالدولہ کی ملازمت اختیار کرلی اور مزاج کی مصلحت پرستی کے سبب بڑی طمانیت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ لیکن آتش کا بقول محمد حسین آزاد۔

''توکل پر گذارہ تھا۔ مگر اس کے باوجود ایک گھوڑا ضرور بندھا رہتا تھا کہ خاندان کا تمغہ بھی قائم رہے۔ سر پر کبھی ایک زلف اور کبھی حیدری چٹیا' کہ یہ بھی محمد شاہی بانکوں کا سِکّہ ہے' اس میں ایک طرہ سبزی کا بھی لگائے رہتے تھے۔ اور ایک بانکی ٹوپی بھوں پر دھرے' جدھر چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ کچھ رنگ فقیری کا بھی تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ زمانے نے ان کے تصاویرِ مضمون کی قدر ہی نہیں پرستش کی مگر انھوں نے جاہ وحشمت سے ظاہر آرائی نہ چاہی' نہ امیروں کے دربار میں جاکر غزلیں سنائیں نہ ان کی تعریفوں میں قصیدے کہے۔''[2]

آتش کی شخصیت کا مکمل خاکہ پیش کرتے ہوئے کچھ گفتگو دیگر خصائل پر بھی کرنا لازم ہے کیونکہ شخصیت اپنے عہد کی زندگی اور تہذیب کی پروردہ ہوتی ہے اور انسان اپنے سماجی پس منظر میں اعمال وافکار' عقائد ونظریات کے غیر معمولی امتزاج سے اپنی شخصیت کی تعمیر وتشکیل کرتا ہے۔ آتش کی شخصیت میں ابتدا سے ایسے خدوخال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جن کا رویہ حقیقت کی

1۔ دبستانِ آتش' شاہ عبدالسلام' مکتبہ جامعہ نئی دہلی' 1977' ص۔50

2۔ آبِ حیات' محمد حسین آزاد' سنِ اشاعت نامعلوم' ص۔478

تلاش وجستجو میں آزادانہ رہا ہے۔

آتش کی عمر عزیز تونگری میں گزری، وہ بے طمع اور بےغرض قسم کے آدمی تھے۔ اکثر فیاضی طبع کی خاطر اپنی دولت کو دعوت وضیافت اور غربا واہل ضرورت میں خرچ کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں دنیا سازی سے زیادہ انسان سازی کو دخل تھا۔ ان کے اخلاق کی بلندی یہ تھی کہ کبھی پست و بلند کی تفریق کو ذہن میں رکھ کر کسی سے مراسم نہیں رکھتے تھے۔ وہ بڑے وسیع المشر ب انسان تھے اس لیے مذہبی تعصب سے بالاتر رہ کر انھوں نے ہمیشہ انسانیت کو فروغ دیا۔ ان کے اخلاقِ حسنہ، مسلک ومذہب کی ترجمانی میں اکثر مرزا غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
مِلّتیں جب مِٹ گئیں، اجزائے ایماں ہوگئیں

اگرچہ ان کے کلام میں بھی غالب سے پہلو مارتے ہوئے بیشتر اشعار مل جاتے ہیں۔ اس قبیل کے اشعار ملاحظہ ہوں جس سے ان کی طبیعت کی وسیع المشر بی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا
مذہب نہیں ہے کوئی ، مِلّت نہیں ہے کوئی

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں ہے آتش
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو، پر انسان ہُوے

اسے آتش کی قانع طبیعت اور شخصیت کی منکسرالمزاجی پر محمول کرنا چاہیے اور ان کی خودداری و اعلیٰ ظرف وضمیر کی علامت تصور کرنا چاہیے کہ انھوں نے کبھی ظاہری زیبائش اور نام و نمود سے لگاؤ نہ رکھا۔ طبیعت کی آزاد پسندی نے کبھی بندگانِ عالی کے آگے سرنگوں نہ ہونے دیا۔ گویا ان کے مزاج کے اِستغنا نے کبھی انھیں دربار یا تختِ شاہی کا طواف کرنے کی اجازت نہ دی اور اگر کبھی امرا کے پاس جانا بھی پڑا تو اپنی آن بان شان کے ساتھ پہنچے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ جب بادشاہ غازی الدین حیدر نے انھیں مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی تو انھوں نے دعوت قبول کرتے ہوئے کہا۔

''فقیر گوشہ نشین ہوں، اتنی اجازت چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے غزل پڑھوں اور گڑگڑی خاص مرحمت ہو۔ بادشاہ نے یہ گذارش قبول کر لی۔''[1]

آتش کی شرافت ونجابت نے کبھی انھیں کسی سے کسی غرض کے لیے ملنے کی اجازت نہ دی۔ آزاد منش ہونے کے سبب ہمیشہ اپنے بوریے کو شاہی قالین پر ترجیح دی۔ اپنی فقیرانہ طرز زندگی کو شہنشاہیت سے بالاتر گردانا۔ نجات حسین خاں تحریر فرماتے ہیں کہ آتش کسی ایرے غیرے کے کہنے پر کبھی کہیں نہیں جاتے تھے۔ بادشاہِ وقت سے متعلق ایک واقعہ کے پس منظر میں کہتے ہیں۔

''معتمدالدولہ آغا میر نے انھیں کئی بار طلب کیا لیکن وہ نہیں گئے۔ یہ بات نواب کو ناگوار گذری۔ ایک بار اپنے نئے مکان پر انھوں نے مشاعرہ منعقد کیا اور تمام حاضرینِ محفل سے کہا کہ کوئی کلام آتش کی توصیف میں لب کشائی نہ کرے۔ جب مشاعرہ ہو رہا تھا تو انھوں نے آتش کو ایک مصرع طرح دیا کہ فوراً غزل کہہ کر شریکِ صحبت ہوں۔ آتش نے سامانِ توہین کو بھانپ کر آغا میر کے نئے مکان کے تعلق سے ایک مطلع کہا اور باری آنے پر آغا میر سے مخاطب ہو کر یہ مطلع پڑھا۔''[2]

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں یاں کی، چہارم آسماں ہے

نواب صاحب مطلع سن کر پھولے نہ سمائے۔ آتش کو خوب داد وتحسین سے نوازا اور ان کے استادانہ فن کے قائل ہوئے۔ نجات حسین خاں عظیم آبادی کا شمار، مصحفی کے بعد ان تذکرہ نگاروں میں ہوتا ہے جن کی آرا خواجہ آتش کی سادگی، سراپا اور اخلاقی بلندی کے بیان میں اہمیت کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ نجات حسین نے جب لکھنؤ کا سفر کیا تو وہ خصوصاً آتش سے بھی ملے تھے اور لکھنؤ کے دورانِ قیام دو مرتبہ آتش کے دولت خانہ پر گئے۔ پہلی مرتبہ 25/مارچ/1843 کو اور دوسری مرتبہ 3/اپریل/1843 کو۔ آتش کو چشم دید دیکھنے کے بعد انھوں نے تحریر کیا ہے کہ

1۔ تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2007، ص۔ 721
2۔ دیوانِ آتش کے قدیم ترین قلمی ومطبوعہ نسخے، اکبر حیدری کاشمیری، شمارہ 330، لاہور، 1986، ص۔ 29

پہلی مرتبہ جب شرفِ ملاقات حاصل ہوا تو انھوں نے دیکھا آتش نہایت سادہ وضع قطع میں کُرتے میں ملبوس زمین پر ایک چٹائی بچھائے ہوئے بیٹھے تھے۔ سفید داڑھی میں ان کا چہرہ بہت پرکشش معلوم ہو رہا تھا۔ بوڑھاپے نے کمر کو خم کر دیا تھا۔ لیکن اخلاق کی عظمت کا یہ عالم کہ بڑے تپاک سے ملے' سفر لکھنؤ اور عظیم آباد (پٹنہ) کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ شعر وسخن کا چرچہ رہا۔ نجات حسین کی دوسری ملاقات بھی آتش سے بڑی خوشگوار رہی۔ شعر گوئی کے ساتھ شاہجہاں آباد سے متعلق اخبارات کی تازہ خبروں پر تبصرہ رہا۔ نجات حسین نے اپنے سفرِ لکھنؤ کی روداد کو ''سوانح لکھنؤ'' کے عنوان سے موسوم کیا ہے اور ایاّ مِ معاشرت لکھنؤ کے ساتھ آتش کی عمر' سراپا' اخلاقِ حسنہ' طبیعت کی سادہ روی' مزاج کا حلیم انداز اور فنِ شاعری سے فطری لگاؤ کو نہایت تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔ ان کا یہ قلمی نسخہ آج بھی ''پٹنہ یونیورسٹی کی لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔''[1]

عمر کے آخری حصے میں آتش کی بینائی جاتی رہی تھی۔ وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ محفلوں میں جانا آنا موقوف کر دیا تھا گویا گھر ہی ان کے لیے گوشۂ عافیت تھا جہاں بیٹھے بیٹھے فکر سخن میں مصروف رہا کرتے تھے۔ انہی ایاّم میں شاہِ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ اختر آتش کے شاگرد ہوئے جو انھیں سو (100) روپیہ ماہانہ پیش کرتے تھے۔ نابینا ہونے کے سبب غزل کی اصلاح کی صورت یہ ہوا کرتی تھی کہ آتش اپنے شاگردوں سے غزل سن کر اصلاح لکھوا دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی واجد علی شاہ خود بھی آتش کی خدمت میں حاضر ہو جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دونوں کے درمیان کچھ بدگمانی پیدا ہو گئی جس کی تفصیل خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت نے ''آبِ بقا'' میں یوں تحریر کی ہے۔

> ''ولی عہدی کے زمانے میں حضرت محمد واجد علی شاہ' آخری شاہِ اودھ' آتش کے شاگرد ہوئے۔ سو روپئے ماہوار دیتے رہے۔ غزل اصلاح کو بھیج دیا کرتے تھے۔ آتش نابینا تھے۔ غزل سن کر شاگرد سے اصلاح لکھوا دیا کرتے تھے۔ ایک شعر پر بادشاہ کو کچھ شک ہوا۔ رفقا سے بیان کیا۔ سب نے کہا خداوند آپ کا شعر بے مثل ہے۔ آتش نابینا ہیں' شاگرد

1۔ آتش: عہد اور شاعری' ڈاکٹر محمد حیات الدین' کتابی دنیا دہلی' 2013' ص۔101-100

جو شعر چاہتا ہے کاٹ دیتا ہے۔ یہ خبر آتش کو معلوم ہوئی۔ دوبارہ غزل آئی اس پر لکھ دیا' ماشاء اللہ خوب غزل کہی ہے۔ اس سہ ماہی میں جتنی غزلیں آئیں سب پر یہی لکھ دیا۔ جب سہ ماہی تنخواہ آئی تو واپس کر دی اور کہا کہ حرام کی تنخواہ نہیں لیتا۔ جب غزل بناتا تھا تنخواہ لیتا تھا۔ اب اصلاح ہوتی نہیں' تنخواہ کس بات کی لوں۔ بادشاہ نے علی تقی خاں وزیر اعظم کو بھیجا۔ آتش نے یہی جواب دیا۔ علی تقی خاں نے شاگردوں سے ناراضی کا سبب دریافت کر کے بادشاہ سے بیان کیا۔ بادشاہ خود معذرت کے لیے آتش کے مکان پر آئے۔'[1]

عشرت کا یہ بیان جہاں آتش کی شخصی دیانتداری اور عزت نفس کی پاسداری کی مثال ہے وہیں ان کے اعلیٰ ادبی کردار کو بھی سامنے لاتا ہے۔ یعنی آتش انسانی مراتب کے قدردان ضرور تھے مگر جو قدردانی شاہِ اقلیم فن کے مراتب کو مجروح کرے یہ کسی بھی حالت میں وہ برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ گویا ادب میں بے ادبیاں انھیں کسی طور پر گوارہ نہ تھیں۔ ان کی چشمِ بصارت ختم ہوئی تو کیا؟ قدرت نے حسّیاتی آنکھ کو تو کھلا رکھا تھا اور اس کو آتش کا تحفظِ خودداری ہی کہنا چاہیے کہ جس نے صاحبِ وقت کو بھی زیر کر دیا۔

بیگم کے انتقال کے بعد آتش کی زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ بینائی سے محروم ہونے کے سبب باہر محفلوں میں آنا جانا بھی موقوف ہو گیا تھا۔ کسی سے ملنا گوارہ نہ کرتے تھے۔ اگر کوئی گھر پر آ کر نیاز مندی حاصل کرنا چاہتا' تو اگر دل نے اجازت دی' ملاقات کی ورنہ آرام کا بہانہ کر کے ملنے سے انکار کر دیتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کے شاگرد میر دوست علی خان ان کی خدمت میں حاضر رہا کرتے تھے۔ ادھر خواجہ محمد علی' شادی کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ صاحب زادے کی شادی کیجیے گھر میں رونق ہو جائے گی۔ لیکن اپنی بے دست پائی اور مالی وسائل کا بحران انھیں اس فرض کی ادائیگی سے روکتا۔ ''آبِ بقا'' کے مصنف کے بیان کے مطابق کہ غالب جنگ کے بیٹے' جے دیال' جو آتش کے شاگرد تھے انھوں نے بڑے حوصلے سے آتش کے اکلوتے

1۔ آتش: عہد اور شاعری' ڈاکٹر محمد حیات الدین' کتابی دنیا دہلی' 2013' ص۔126-125

بیٹے محمد علی جوش کی شادی کا اہتمام کیا اور جلسے کی دھوم دھام کے لیے دلا رام کی بارہ دری لی گئی۔ تمام دوست واحباب اپنے پرائے شاگرد وعزیز جمع ہوئے اور

''جب محمد علی نوشہ بن کر آتش کے سامنے آئے تو آپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ شاگردوں نے عرض کیا۔ استاد یہ وقت خوشی کا ہے خدا نے آپ کو بیٹے کا سہرا دکھایا۔ خدا کا شکر بھیجئے بدشگونی نہ کیجیے۔ ان کی اولاد سے خدا آپ کی نسل قائم رکھے۔ کہنے لگے میں اس بات پر روتا ہوں کہ محمد علی کی والدہ جو خوش ہونے والی تھی وہ زندہ نہیں ہے جو اپنے بیٹے کو دولہا بنے ہوئے دیکھے۔ میں آنکھوں سے اندھا ہوں۔ صورت دیکھ نہیں سکتا۔ یہ کون سا خوشی کا مقام ہے۔ خیر تم لوگوں کو خدا مبارک کرے۔''1

تذکرہ نگار خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت نے خواجہ آتش کے آخری دنوں کے بارے میں کچھ ایسے لوگوں کے بیان درج کیے ہیں جنھوں نے آخری عمر میں آتش کا دیدار کیا اور انھیں آتش کی صحبتِ فیض بھی حاصل رہی۔ ایسے اشخاص میں نواب محمد علی خاں قمر عرف چندا میاں' اودھ کا آخری فرماں روا واجد علی شاہ اختر' منشی قمر' خواجہ محمد بشیر' خواجہ رکن الدین اور نجات حسین خاں عظیم آبادی وغیرہ کے نام اور فرمودات اس لحاظ سے اہم ہیں کہ یہ حضرات آتش کے آخری ایام کے چشم دید گواہ ہیں۔ نجات حسین خان عظیم آبادی اور شاہ واجد علی اختر کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ آتش کے سلسلے میں تقریباً سبھی کی متفقہ رائے یہی ہے کہ آتش کی طبعیت میں خلوص اور راست بازی کے بے شمار عناصر تھے۔ ''کبرسنی میں نابینا ہو گئے تھے مگر چہرے سے بانکپن ٹپکتا تھا۔ ایسا متوکل آدمی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔'' خواجہ محمد بشیر نے اپنی کمسنی کے وقت آتش کا دیدار کیا تھا وہ خواجہ رکن الدین کے ہمراہ اس وقت آتش کے یہاں پہنچے تھے کہ جب ان کی بیماری کی خبر شہر لکھنؤ میں عام ہوئی۔ منشی قمر بھی بیماری کا شہرہ سن کر بغرض ملاقات آتش کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ''آبِ بقا'' کے مصنف نے منشی قمر کے حوالے سے آتش کے مکان کا نقشہ اس وقت کا حلیہ' قوتِ گویائی سے معذوری' شاگردانِ عزیز کا مجمع' انتقال وتدفین وغیرہ کا ذکر ان الفاظ

1۔ آتش: عہد اور شاعری' ڈاکٹر محمد حیات الدین' کتابی دنیا دہلی' 2013' ص۔123

میں تحریر کیا ہے۔

''آتش کا مکان ماہولال کی چڑھائی پر تھا۔ جہاں اب چونے والی بھٹی ہے۔ کچا مکان تھا۔اس پر ایک چھپر پڑا ہوا تھا۔تقریباً اسّی (80)، بیاسی (82) برس کا ایک آدمی چاروں ابرو کا صفایا، رنگ کھلتا ہوا چارپائی پر لیٹا تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا یہی آتش ہیں۔ کچھ منھ سے کہنا چاہتے تھے آواز نہ نکل سکی۔شاگرد لوگ نرکل کی چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ہم لوگ تھوڑی دیر کھڑے رہے پھر چلے آئے۔اس کے آٹھ روز کے بعد سُنا کہ آتش کا انتقال ہوگیا۔اور اپنے مکان میں دفن کیے گئے۔'' 1

اس عظیم با کمال شاعر نے لکھنؤ ہی میں وفات پائی۔محمد حسین آزاد نے بھی آتش کی موت وزندگی کے واقعے کو یوں بیان کیا ہے کہ۔''ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے یکا یک موت کا ایسا جھونکا آیا کہ شعلے کی طرح بجھ کر رہ گیا۔'' اور میر دوست علی خلیل نے تجہیز وتکفین کے بعد اپنے اُستاد کے جسدِ خاکی کو مکان ہی میں دفن کر دیا۔آتش کی تاریخِ وفات کو اگر چہ کئی شعرا نے اپنے اپنے قطعات میں بیان کیا ہے۔لیکن عزیز شاگرد میر علی اوسط رشک نے انتقال کی تاریخ کے ساتھ ساتھ دن، وقت اور سیرت وکردار کا بھی ذکر کیا ہے۔ان کے تحریر کردہ تین قطعات ایسے ہیں جن کے مطالعے سے آتش کی شخصیت، سیرت واخلاق اور اردو شاعری میں ان کے مقام ومراتب پر روشنی پڑتی ہے۔اس قبیل کا صرف ایک قطع دیکھیے۔

مردِ نیک وشاعر جادو بیاں وضع دار ازمحاسن ممتلی بودند آتش، ہائے ہائے
جائے ایشاں در گلستانِ جناں بے وجہ نیست آتش گل واقعی بودند آتش، ہائے ہائے
رشک تاریخِ وفات آں چہ عالم سوز گفت یادگارِ مصحفی بودند آتش، ہائے ہائے

میر علی اوسط رشک نے ایک قطع میں خواجہ حیدر علی آتش کا انتقال بروز چہار شنبہ/ 25 محرم/ 1263ھ مطابق 1847 کو صبح چار بجے بتایا ہے۔لیکن ان کے دفن ہونے کے بارے میں اختلافِ رائے ہے۔اوسط علی رشک کے مطابق کہ استاد کو مکان ہی میں دفن کیا گیا۔''آبِ بقا''

1۔ آتش: عہد اور شاعری، ڈاکٹر محمد حیات الدین، کتابی دنیا دہلی، 2013، ص۔129

میں بھی گھر ہی میں دفن ہونے کی بات سامنے آئی ہے اور بعد کے لوگوں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ آتش کو ان کے مکان جو، ماہولال کی چڑھائی پر تھا اس میں دفن کیا گیا۔ افسوس صد افسوس کہ اب نہ وہ گھر ہے نہ قبر۔ البتہ ان کا کلام رہ گیا ہے۔ اگر چہ اس ابدی حقیقت پر وہ خود بھی ایمان رکھتے تھے۔ اسی لیے تو شعر کی زبان میں کہہ گئے۔

شعر ڈھلتے ہیں مری فکر سے آج اے آتش
مر کے کل گور کے سانچے میں، میں ڈھل جاؤں گا

یقیناً وہ گور کے سانچے میں ڈھلے لیکن تاریخِ پیدائش کی طرح ان کے مزار کی نشاندہی بھی آج شک وشبہ کے دائرے میں ہے۔

''سلامت رضوی نے اپنے والد کے حوالے سے اس خیال کی وضاحت کی ہے کہ چوپٹیوں کے راستے ہوتے ہوئے جب کٹرہ میں داخل ہوتے ہیں تو تھوڑے فاصلے پر ایک بڑا سا درخت ہے اس کے نیچے چونے سے پُتی سفید قبر خواجہ آتش کی ہے۔''1؎

اس واقعہ کو انھوں نے موثر حکایتی انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن ''بڑا سا درخت'' کہتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ وہ آم، نیم، پیپل، املی، برگد گویا کس کا درخت ہے۔ بہرحال ماہ وسال کے دبیز گرد آلود پردوں کے پیچھے اب صرف خیال آرائیاں ہی رہ گئی ہیں جس میں ایک گروپ کی متحدہ رائے یہ ہے کہ آتش کو انہی کے مکان میں مدفون کیا گیا ہے۔ تو دوسرا نخاس بازار سے متصل کنگھی والی گلی میں دفن کرنے پر ایمان رکھتا ہے۔2؎

خواجہ حیدر علی آتش کے فرزند خواجہ محمد علی جوش کو اپنے مشہور بزرگ باپ سے جدا ہونے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ انھیں اپنی زندگی بالکل بے کیف اور خالی خالی معلوم ہونے لگی۔ ماں پہلے ہی رخصت ہوگئیں اور اب شفیق باپ کا بھی ساتھ چھوٹ گیا۔ ہر وقت گم صم رہنے لگے۔ احساسِ تنہائی اور مایوس خیالوں کی گھٹا دل پر چھائی رہتی اور انھیں اپنی یتیمی وبیسری کا احساس دلاتی رہتی۔

1۔ دیدہ وشنیدہ، سلامت رضوی، مطبع سیفی بک ڈپو بمبئی، ص۔121-120

2۔ مشاعرۂ عالمِ ارواح، سید مرتضٰی حسین موسوی، سرفراز پریس لکھنؤ، 1928، ص۔17

اب انھیں انسانی صحبتیں کسی طرح خوش نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے وہ ہر محفل سے گویا کنارہ کش ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ مشاعروں کی محفلوں میں بھی جانا بند کر دیا اور باپ کی جدائی کا ایسا شدید غم کھایا کہ ایک دو سال کے اندر، خود بھی تمام ہو گئے۔ خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت کا بیان ہے کہ۔

''خواجہ محمد علی جوش کو بزرگ اور نامور باپ کے مرنے کا بہت صدمہ ہوا اور صحبتِ مشاعرہ میں جانا موقوف کر دیا۔ ابھی دو برس نہ گزرے تھے کہ یہ ہیضہ میں دفعتہً مبتلا ہوئے اور دو دن میں تمام ہو گئے۔ رشک مرحوم نے ان کے انتقال کی تاریخ لکھی۔'' 1

کجائی تو خواجہ محمد علی
ز ہیضہ مگر رفتی افسوس حیف
دلت آتش داغ بابا بسوخت
چہ بریاں جگر رفتی افسوس حیف
پئے خدمت خواجہ حیدر علی
ز دنیا بدر رفتی افسوس حیف
چنیں گفت تاریخ فوت تو رشک
بنزد پدر رفتی افسوس حیف

لہٰذا رشک کے مذکورہ قطعہ سے خواجہ محمد علی کی تاریخ وفات 1264ھ نکلتی ہے۔ اور اس طرح خواجہ محمد علی جوش تک ہی خاندان آتش کے حالات سامنے آئے ہیں۔ جوش کے بارے میں کوئی تفصیلی بیان نہیں ملتا کہ وہ صاحبِ اولاد تھے یا نہیں، اس کا ذکر کسی بھی تذکرہ نگار نے نہیں کیا۔ لہٰذا گمان غالب ہے کہ خواجہ محمد علی جوش ہی خاندانِ آتش کا آخری چراغ تھا سو وہ بھی گُل ہو گیا۔

1۔ آبِ بقا، خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت، نامی پریس لکھنؤ، 1928، ص۔ 39

ادبی و تخلیقی سفر

خواجہ حیدر علی آتش فیض آباد اور لکھنؤ میں پیدا ہونے والی اس نسل کے روشن چراغ ہیں جن کے باپ دادا دہلی کے بحرانی حالات سے پریشان ہو کر فیض آباد میں آباد ہوئے۔ یہ وہ شہر تھا جس کی نواب شجاع الدولہ کی حکمتِ عملی سے بڑی ترقی ہوئی تھی جس کے باعث اس کے عہد کو ''عہدِ زریں'' کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ وہاں کی خوشحالی، مالی استحکام، طمانیت افروز فضا اور علوم و فنون کے ماحول نے انھیں ایسا متاثر کیا کہ وہ بھی یہیں کے ہو رہے۔ خواجہ حیدر کی پیدائش اسی شہر میں ہوئی لیکن کم عمری ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے سبب تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ مگر اپنے ماحول کے پروردہ آتش نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں استعداد بہم پہنچائی۔ خصوصاً فارسی زبان پر انھیں عبور حاصل تھا کیونکہ فارسی زبان سے گہری دلچسپی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ خود ان کے استاد غلام ہمدانی مصحفی نے لکھا ہے کہ ''میلانِ طبش بہ طرف فارسی بیشتر بود۔''[1]

لہٰذا گمان غالب ہے کہ آتش کی شاعری کا ابتدائی نقشہ فیض آباد میں ہی رہ کر بنا۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے رواج کے مطابق امیروں اور نوابوں کی صحبتِ خاص نے انھیں آدابِ

1۔ تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، 2007، ص۔ 722

مجلس کے ہنر بھی سکھا دیے۔ بہادری اور حربی فنون کی قدر افزائی اور ستائش کے اس ماحول نے اس جانب' کہ جسے میر تقی میر کی زبان میں فنِ شریف کہا جاتا ہے' طبیعت کو پورے طور پر مائل نہ ہونے دیا۔ کہا جاتا ہے کہ فیض آباد میں اقامت پذیر نواب مرزا محمد تقی کے یہاں شیخ ناسخ کی طرح آتش نے بھی ملازمت اختیار کی تھی۔ نواب صاحب خود بھی شاعر تھے اور ترقی تخلص رکھتے تھے۔ اس وقت ان کا دربار رونق پر تھا۔ وہ ایک وضع دار انسان ہونے کے ساتھ ساتھ علم و ہنر کے بھی قدر دان تھے۔ چنانچہ اس سے یہ اندازہ لگانا بے محل نہ ہوگا کہ ان کی صحبت سے آتش کی شاعری کا چراغ روشن ہوا اور پھر اسے آتش کا نواب مرزا صاحب کی ذات سے خاص تعلقِ خاطر ہی کہنا چاہیے کہ جب غازی الدین حیدر کے عہد میں انھوں نے فیض آباد کو خیر باد کہہ کر مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی تو آتش نے بھی وہاں سے کوچ کیا اور لکھنؤ پہنچ کر محنت و مشاقی سے شاعری کی ایسی شمع روشن کی جس کا خمیر شاید فیض آباد میں تیار ہو چکا تھا۔ آبیاری کے لیے صرف توجہ اور ماحول چاہیے تھا۔ اگر چہ اس کی تائید میں کوئی سند نہیں ملتی اور نہ شعری شکل میں کوئی عملی ثبوت۔ لیکن استاد مصحفی کی نظر کی پرکھ ضرور اشارہ کرتی ہے کہ خانۂ دل و دماغ میں شعری مادہ تیار ہو چکا تھا جسے اعتبار چاہیے تھا۔ لہٰذا یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شہر فیض آباد کی مٹی کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اس نے خواجہ حیدر علی کی شکل میں آتش کو جنم دے کر ایشیا کا ایسا شاعر اردو ادب کے حوالے کیا جس کے کلام کی جاندار آواز اور مردانہ لہجے نے انسان کی عزت و عظمت کا احترام کرنا سکھایا اور بہ بانگِ دہل یہ نعرہ بلند کیا۔

شرط ہے رتبۂ مردانِ خدا کا انصاف
ڈوبا فرعون وہیں موسیٰ پایاب اُترا

خواجہ آتش کی شاعری کے بارے میں تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ انھوں نے شاعری کی ابتدا فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کی۔ لیکن اس حقیقت سے پردہ کسی ناقد یا تذکرہ نگار نے نہیں اٹھایا کہ ابتدا میں انھوں نے کس زبان میں شعر کہا فارسی یا اردو؟ ان کا پہلا شعر یا غزل کونسی ہے؟ فیض آباد میں وہ کس کے تلمیذ تھے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب آج بھی پردۂ خفا میں ہیں۔ ہاں! استاد مصحفی کا تذکرہ دوم ''ریاض الفصحا'' (1806) میں یہ

بات مذکور ہے کہ ابتدا میں آتش دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔لیکن طبیعت کا میلان فارسی کی طرف زیادہ تھا۔

آتش کے ادبی وتخلیقی سفر کے ابتدائی نقوش کو تلاش کرتے ہوئے مصحفی اور دیگر تذکرہ نگاروں کے تحریری بیان سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ ان کی طبیعت میں شاعری ابتدائے شعور سے موجود تھی اور یہ پودا فیض آباد کے قیام کے زمانے میں اُ گا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔لیکن لکھنؤ پہنچ کر آتش نے جس دنیا میں قدم رکھا وہ ان معنوں میں حیرت واستعجاب میں ڈالنے والی تھی کہ یہاں شعر گوئی اور شعر پسندی آداب میں داخل تھی۔گلی، کوچے شعروشاعری اورفن وہنر کے چرچے تھے۔یہ شہر برِصغیر میں سب سے خوشحال اور پُر امن تھا۔آصف الدولہ کی فیاضیوں کے چرچے دور دور تھے۔ان کی طبیعت کی فیاضی کے سبب ہی یہ کہاوت مشہور ہوئی تھی کہ ____ ''جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ۔'' وہ علم وادب کا بھی قدر دان تھا۔اگر لکھنوی شاعری کی اصل بہار کو شاہ آصف الدولہ کے عہد سے منسوب کیا جائے تو مبالغہ نہیں۔کیونکہ شعروادب سے اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جب اس نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت بنایا تو تین لاکھ کتابوں پر مشتمل ایک شاندار کتب خانہ تعمیر کیا تھا جو اس کے ادبی ذوق کا مظہر ہے۔نوابین اودھ میں آصف الدولہ سے لے کر آخری شاہ واجد علی تک کے عہد کو لکھنوی تہذیب وادب کا یادگار دور کہا جا سکتا ہے اور خصوصاً صنفِ غزل پر توجہ مرکوز کرنے میں شاہانِ اودھ کے آخری دور کو بڑی اہمیت حاصل رہی، مثلاً۔واجد علی شاہ اختر جو نہ صرف شاعر تھا بلکہ بہت سے علوم وفنون کا ماہر بھی تھا بقول مسعود حسن رضوی ادیب ''وہ سو(100) سے زائد کتابوں کا مصنف تھا۔'' لہٰذا ان سخن سنج شاہان کے عہد میں دولت کی فراوانی، فن کی قدر دانی، امن وسکون کی فضا کو دیکھ کر دیگر شہروں کے پناہ گزینوں کو عافیت نظر آئی چنانچہ بہت سے اہلِ کمال مثلاً۔میر، سودا، مصحفی، جرأت اور انشا وغیرہ زمانے کے سرد وگرم سہتے ہوئے بالآخر لکھنؤ پہنچے۔

دہلی سے لکھنؤ آئے ہوئے ان شعرا نے ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی جس میں دہلویت کے ساتھ لکھنویت نے جگہ پائی۔جرأت کے اشعار ہر خاص وعام کا وظیفہ ہوئے اور انشاو مصحفی کی معرکہ آرائیوں کی گرم بازاری نے لوگوں کو شعروفن کی نزاکتوں کا شعور بخشا۔اگر چہ

مذکورہ شعرا کی شاعری کی ابتدا دہلی میں ہوئی مگر انھوں نے عروج لکھنؤ میں پایا۔ لہٰذا بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی دہلی سے لکھنؤ آئے ہوئے۔

''یہ شعرا ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ ان حالات میں جب آتش لکھنؤ پہنچے تو جرأت کے اشعار زبان پر تھے۔ انشا اور مصحفی کے معرکے گرم تھے۔'' 1؎

لہٰذا دہلی اور لکھنؤ کے سیاسی و معاشی حالات اور مہاجر، شعرا کی تفصیلات بیان کرنے کا اصل مدعا یہ ہے کہ عہد ماضی کی تصویر اس خیال کی تائید کر رہی ہے کہ انسان کو عزت اور توقیر حاصل کرنے کے لیے ہر عہد میں اپنی اہلیت کو ثابت کرنا پڑتا ہے تب کہیں اعتبار کا درجہ حاصل ہوتا ہے جس کی زندہ مثال مذکورہ شعرا کے ساتھ خود آتش کے استاد مصحفی کی ہے کہ بے روزگاری کے عذاب نے انھیں دیارِ غیر میں لا کھڑا کیا تھا۔ دہلی کی تباہی و بربادی پر ماتم کناں ہوتے ہوئے انھوں نے بھی یوں کہا ہے۔

دلّی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلّے سنسان گھر پڑے ہیں

مصحفی ایک مہمان شاعر کی حیثیت سے وارد ضرور ہوئے تھے لیکن اپنی علمی لیاقت اور خداداد شعری صلاحیت سے انھوں نے ایک ایسا ادبی ماحول پیدا کر لیا تھا کہ نو آموز شعرا اصلاح کی غرض سے ان کے پاس آنے لگے اور اس طرح اپنے معاصر میں انھیں استادالاستاد کا درجہ حاصل ہو گیا۔ واضح ہو کہ اس زمانے میں سب سے زیادہ تعداد مصحفی ہی کے شاگردوں کی تھی۔ تذکرہ'' ریاض الفصحا''میں اس بابت انھوں نے خود تحریر کیا ہے کہ

''درزبانِ اردوئے ریختہ قریب صدکس امیر زادہا و غریب زادہا بحلقۂ شاگردی من آمدہ باشند فصاحت و بلاغت را از من آموختہ۔'' 2؎

1۔لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جلد اوّل، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی 2008، ص۔33
2۔فکر و تحقیق سہ ماہی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2001، ص۔160

اس زمانے میں اصلاحِ سخن کا رواج عام تھا۔ ہر مبتدی کسی نہ کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہ کرتا تھا اور تلمیذِ مصحفی ہونا وقار وافتخار کی بات سمجھی جاتی تھی لہٰذا ادبی ماحول کی فضا اور مسابقتی ماحول میں جب آتش، مصحفی کی سرکار میں بہ غرض شعر کی اصلاح حاضر ہوئے تو ان کی جہاں دیدہ نگاہوں نے شاگرد کی ذہانت و فطانت اور درّاکیِ طبع کو دیکھ کر اس کے روشن مستقبل کا اندازہ لگاتے ہوئے محسوس کرلیا تھا کہ غیر معمولی فطری موزونیت رکھنے والے اس نوجوان میں شاعری کی بے پناہ صلاحیت ہے اور یہ مژدہ انھوں نے بڑی محبت اور شفقت سے یوں سنایا کہ ''اگر زندگی نے وفا کی تو یہ شخص یکتائے روزگار ہوگا۔''

اور ہوا بھی یہی کہ وسیع القلب استاد کی خصوصی توجہ نے آتش کی فطرت میں موجود ذوقِ شاعری کو بے حجاب کر دیا۔ آتش کی افتادِ طبع میں شاعری کا شعور پہلے ہی سے کارفرما تھا بس اسے صیقل کرنے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا لکھنؤ کی ادبی محفلوں، علمی صحبتوں اور استاد کی محنتوں سے آتش کی شاعری غنچہ کی طرح شگفتہ ہوئی جس کی خوشبو نے انھیں اپنے عہد کے مسلم الثبوت شاعر کا درجہ عطا کیا اور تلازمۂ مصحفی میں نمایاں شاگرد کی حیثیت سے استاد کا سر بھی بلند کیا۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری کے مصنف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی آتش کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں۔ '' اُنتیس (29) سال کی عمر میں مصحفی کے بقول اردو شاعری کی باضابطہ ابتدا ہوئی۔'' 1 اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ آتش کی شاعری کو بامِ عروج پر پہنچانے میں تین نکات کو خاصا دخل ہے۔ اوّل، اُنتیس (29) سالہ پختہ عمر کا شعور۔ دوم، مخصوص ماحول میں شخصیت کی نشو ونما۔ سوم، استاد مصحفی کی خاص نظرِ التفات۔ چنانچہ یہ تین نکات ہیں جنھوں نے ان کے فطری مذاقِ سخن میں معاونت کی تھی۔

خواجہ آتش کی شعری نگارشات میں چند قصائد اور غزلیہ کلام موجود ہے لیکن صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو صنفِ غزل ہی ان کی شخصیت کی پہچان بنی اور اس اختصاری فن میں انھوں نے اپنے خوب جوہر دکھائے جس کے سبب ایک ناقد نے انھیں '' شاعر آتش زبان و سخن در گرم بیاں'' سے یاد کیا اور فنِ شاعری میں ایک مخصوص نقطۂ نظر کا ایسا شاعر کہا جو اردو شاعری میں اپنی طرزِ خاص اور منفرد لب و لہجے سے پہچانا گیا۔ اس ضمن میں چند شعر ملاحظہ ہوں۔

1۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جلد اوّل، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، 2008، ص۔46

پھر گئے ہیں معرکوں میں مجھ سے تلواروں کے منھ
سخت جانی نے مری توڑے ہیں خنجر سیکڑوں

وہ گرم رو بادۂ عشق و جنوں ہوں
جلتا ہے چراغ آج مرے نقشِ قدم سے

زیرِ دیوار جو ٹھہروں تو حسد سے میرے
سایہ سر پر سے دبے پاؤں رواں ہوتا ہے

سر شمع سا کٹائیے پر دم نہ ماریئے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریئے

خار کا کھٹکا نہیں رکھتے ہیں ہم آتش قدم
موم ہو جائے اگر آ جائے آہن زیرِ پا

یہ اشعار خواجہ آتش کی جرأت مندی، بانکپن اور مردانہ لب و لہجے کے غماز ہیں جس میں زندگی کی قوت اور عزم و حرارت کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یعنی شعر میں آواز کی یہ للکار، معرکہ آرائی، طاقت کا یہ نشہ اور سرور کی اس ترنگ نے ہی خواجہ آتش کو دیگر شعرا سے امتیاز بخشا اور ان کی شاعری جاندار شخص کا وہ اعلانیہ بن گئی جس میں زندگی خون کی گردش کے ساتھ سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اگر چہ ان کی زبان کا نکھار استاد مصحفی کے صحبت کا اثر معلوم ہوتا ہے لیکن لہجے کی طمطراق کا تعلق خود ان کی ذات سے ہے اور جس میں ان کی افتادِ طبع کو بڑا دخل ہے۔

آتش کے یہاں اگر ایک طرف طبیعت کا یہ رنگ ہے تو دوسری جانب قلندرانہ شان، فقیرانہ مزاج اور خود ستائش سے باز رہنے کا عمل بھی نظر آتا ہے۔ جو ان کی جدی خصوصیت ہے یعنی جس اخلاقی و تہذیبی اور متوکل عقائد کی تعلیم کے ساتھ، ان کی پرورش ہوئی اس نے انھیں آزادہ روی

اوررندمشرب طریقے پرکاربندرہ کرزندگی کا گزران کرنا سکھایا۔چنانچہ جن اوصاف سے مزاج کا خمیر تیار ہوااس کی گونج شاعری میں یوں سنائی دیتی ہے۔

مرد درویش ہوں تکیہ ہے توکل میرا
خرچ ہرروز ہے یاں آمدِ بالائی کا

چھوڑ کر ہم نے امیری' کی فقیری اختیار
بوریے پر بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مارکر

منزل فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے

خواجہ آتش کی طبیعت میں فقر وقناعت کا مادّہ تھا۔انھوں نے کبھی کسی صاحبِ وقت کے درِدولت سے وابستہ رہنا پسند نہیں کیا جس کی صداقت مذکورہ اشعار سے بھی ظاہر ہے۔جہاں تک صنفِ قصیدہ نگاری کی بات ہے تو یہ فن مدح سرائی وحُسنِ طلب سے عبارت ہے اور جس شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ

تدبیر سے تو کام نہ تقدیر کا ہوا
تکیہ خدا پہ کیجیے دروازہ بھیڑ یے

گویا خدا کی ذات پر تکیہ کرنے والے خواجہ آتش بندگانِ خدا کے سامنے کیسے سرنگوں ہو سکتے ہیں؟اگر چہ مختلف ذرائع سے صرف تین قصائد تک رسائی ہوئی ہے جن میں پہلا نواب روشن الدولہ کی شان میں ''چودہ اشعار پر مشتمل ہے''[1] جسے علی جواد زیدی کی کتاب ''قصیدہ نگارانِ اتر پردیش'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ دوسرا' نواب امجد علی شاہ اور تیسرا 'امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں ہے۔

''اور یہ دونوں قصائد خود آتش نے اپنی زبان سے نجات حسین خاں عظیم

1۔ آتش:عہد اور شاعری' ڈاکٹر محمد حیات الدین' کتابی دنیا دہلی' 2013' ص۔155

آبادی کو 25 مارچ / 1843 میں پہلی ملاقات کے دوران اپنے قیام گاہ پر
سنائے تھے۔ نجات حسین خاں عظیم آبادی نے اپنے سفر نامہ ''سوانح لکھنؤ''
میں صرف آتش کی پانچ غزلوں کے اشعار نقل کیے ہیں لیکن بدقسمتی سے
انھوں نے آتش کے قصائد سے کوئی شعر بھی درج نہیں کیا ہے۔'' 1؎

خواجہ آتش کے ادبی وتخلیقی سرمایہ میں کل دو دیوان موجود ہیں جو صرف غزلیات پر مبنی ہیں۔ آتش چونکہ غزل کے شاعر تھے اس لیے ان کے کمالِ فن اور فنی معرکوں کو صرف اسی صنفِ سخن میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کا پہلا دیوان ان کی زندگی ہی میں 1256ھ / 1840 میں علوی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ دوسرا وفات کے بعد' دوستوں نے ان کے منتشر کلام کو یکجا کر کے 1268ھ / 1852 میں لکھنؤ سے شائع کیا۔ ان دونوں دواوین میں تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشعار شامل ہیں۔ جس کا تفصیلی ذکر اس طرح ہے کہ۔

'' دیوانِ اوّل میں پانچ سو غزلیں اور دیوان دوم میں 129 غزلیں
ہیں۔ دیوان دوم میں ایک فرد بھی ہے اس کے حاشیے پر مظفر علی اسیر کا ایک
قطع اور میر ولد حسن فوق کے دو قطعات خواجہ حیدر علی آتش کے وصال پر
درج ہیں۔'' 2؎

لہٰذا خواجہ آتش کی ادبی وتخلیقی کائنات میں تین قصائد' ایک طویل واسوخت اور دو دواوین کا پتہ چلتا ہے۔ دراصل واسوخت وہ صنفِ سخن ہے جس میں دوست اپنے معشوق کی بے وفائی و بے اعتنائی' وعدہ شکنی اور ہجر و فراق کے معاملات کو شکایتاً بیان کرتا ہے۔ کیونکہ واسوخت کے لغوی معنی جلانے کے ہیں۔ لہٰذا اس صنف میں محبوب تغافلِ یار کی شکایتیں کرتا ہے اور اسے ہر طور سمجھانے کی کوششیں بھی کرتا ہے۔ دیگر اصنافِ سخن کی طرح اس صنف کو بھی لکھنوی معاشرت میں دہلی کے مہاجر شعرا کے ہاتھوں فروغ ہوا۔ خصوصاً میر اور سودا کے ہاتھوں ابتدائی سفر طے کرنے کے بعد جرأت کے ہاتھوں یہ صنف بامِ عروج کو پہنچی۔ واجد علی شاہ کا دور اس صنف کے

1۔ آتش: عہد اور شاعری' ڈاکٹر محمد حیات الدین' کتابی دنیا دہلی' 2013' ص۔156
2۔ آتش: عہد اور شاعری' ڈاکٹر محمد حیات الدین' کتابی دنیا دہلی' 2013' ص۔156

عروج کا زمانہ کہا جاتا ہے کہ جس میں لکھنؤ کے تہذیبی ماحول اور زندگی کی رعنائی وشادابی کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ لہٰذا

''اس عہدِ معاشرت میں واسوخت کا اثر اس قدر بڑھا کہ خواجہ حیدر علی آتش جیسے غزل گو شاعر نے بھی اپنی ایک پوری غزل کو واسوخت کے رنگ و آہنگ سے آراستہ کیا۔'' 1؎

آتش کے مذکورہ اکلوتے واسوخت کا ذکر خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی اپنی کتاب ''مقدمہ کلامِ آتش'' میں کیا ہے جو 26 بندوں پر مشتمل ہے۔ آتش نے اسے اپناتے ہوئے لطیف انداز میں محبت کی باتوں کو محبت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اور منظر کشی کے پہلو کو روا رکھتے ہوئے منظری بیان کی تصویر اپنے قاری کے سامنے رکھ دی ہے' ساتھ ہی اس بات کا خیال رکھا ہے کہ عشق و محبت کے فطری عمل میں ان کی شاعرانہ انفرادیت قائم رہے۔ اس شعری صنف کو ''انتخابِ کلام'' باب چار (IV) میں شامل کیا گیا ہے۔ جسے صحت مند جنسیت کے طور پر عشقیہ شاعری کا بہترین نمونہ سمجھنا چاہیے۔ خواجہ آتش کے دونوں دواوین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دوسرا دیوان رنگ و آہنگ کے اعتبار سے پہلے دیوان سے قدرے مختلف ہے۔ اگر چہ

''عشقیہ مضامین دونوں ہی دواوین کا طرۂ امتیاز ہیں۔ لیکن دیوانِ اوّل میں زیادہ اشعار معشوق کے ظاہری حسن اور زیب و زینت سے متعلق ہیں بہ خلاف اس کے دوسرے مختصر دیوان میں شامل غزلوں میں نسبتاً زیادہ سنجیدگی' زیادہ رچاؤ اور زیادہ گہرائی نظر آتی ہے اور اس میں بہت سے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں محبوب کے حسن کے بجائے عشق کی لطیف کیفیتوں کو خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔'' 2؎

بہر حال شاعری بھی وقت ماحول اور معاشرے کے مطالبات کا تقاضہ ہوتی ہے' اور ممکن ہے کہ خواجہ آتش نے بھی دیوانِ اوّل میں اپنے عہد کے مذاق کے مطابق اپنی شاعری کو گردو

1۔ آتش: عہد اور شاعری' ڈاکٹر محمد حیات الدین' کتابی دنیا دہلی' 2013' ص۔ 233

2۔ انتخاب خواجہ حیدر علی آتش' مرتبہ ولی الحق انصاری' اُتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ' 2004' ص۔ 10

پیش کی حقیقتوں کا آئینہ دار بنایا ہوا اور ظاہری حسن اور زیب و زینت سے آراستہ کیا ہو۔لیکن آخری دور کی غزلیں، سنجیدگی کا مظہر ہیں تو یہ عمر کی پختہ کاری اور مطالباتِ وقت کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔لہٰذا خواجہ آتش کی شاعری کے وقتاً فوقتاً متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔شاعری کو زندگی تصور کرنے والے اس شاعر کے فکری سرچشمے آج بھی انسان کو حیات و کائنات کے غیور مشاہدہ ومطالعہ کی دعوت دے رہے ہیں کہ

مرید کر کے مجھے پیر عشق نے اپنا
مشاہدہ کو اک آئینۂ جمال دیا

تخلیق و تالیف کا رشتہ صرف کاغذ اور قلم تک محدود نہیں ہوتا۔ جب کوئی بت تراش کسی بے ڈول پتھر کو تراش خراش کر ایک انسانی شکل دیتا ہے تو پھر وہ پتھر، معمولی پتھر نہیں رہتا جس کی زندہ مثال اجنتا اور ایلورہ کے وہ بُت ہیں جو ہزاروں سال گذر جانے پر بھی اپنے خالق کی یاددلا رہے ہیں۔اسی طرح جب کوئی مصوّر تصویر بناتا ہے اور اس کی رنگ آمیزی سے وہ تصویر منھ بولتی تصویر معلوم ہوتی ہے تو دیکھنے والا یہ ضرور پوچھتا ہے کہ اس کا خالق کون ہے؟

کہا جاتا ہے پہلے زمانے میں اچھے اور کامیاب شاعروں کی پہچان ان کے شاگردوں کی کثیر و قلیل تعداد سے ہوا کرتی تھی اور اسے بھی تخلیقی عمل کا ایک بلند کارنامہ تصوّر کیا جاتا تھا۔ شاگرد اپنے استاد سے صرف شاعری پر ہی اصلاح نہیں لیتے تھے بلکہ استاد ان کی ادبی شخصیت کے ساتھ تربیت بھی کیا کرتے تھے۔اردو ادب میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ یہاں صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔اوّل، الطاف حسین حالی نے جب مرزا غالب کے دامنِ تلمّذ سے وابستہ ہو کر شعری اصلاح لینا شروع کیا تو جلد ہی ان کا رجحان دیگر اصناف کی جانب ہوا اور پھر جب انھوں نے شاعری ترک کرنے کا ارادہ کیا تو ان کے استاد غالب ہی تھے جنھوں نے ان کے اندر شعری صلاحیتوں کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا تھا کہ اگر تم شاعری کرنا چھوڑ دو گے تو اپنے اوپر ظلم کرو گے۔لہٰذا آج کون ایسا ہے جو حالی کے کلام کا معترف نہیں ہے۔حالی نے بھی حق شاگردی ادا کرتے ہوئے ''یادگارِ غالب'' لکھ کر اپنے استاد کو دنیائے ادب میں زندہ جاوید بنادیا ہے۔

دوسری اہم مثال ہمارے سامنے 20ویں صدی کے اس شاعر کی ہے جسے شاعرِ مشرق

علامہ اقبال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر ابتدا میں انھیں مولوی میر حسن شاہ نہ ملتے تو شاید وہ نہ ہوتے جو آج ہیں۔ صرف میر حسن شاہ ہی وہ شخص تھے جن کے فیضِ تعلیم و تربیت اور اخلاقیات کی تعلیم نے اقبال کو علامہ کے درجے تک پہنچایا' اور شاگرد علامہ اقبال کا بھی اپنے استاذ' میر حسن شاہ کے تئیں جذبۂ احترام دیکھیے کہ جب ''شمس الاسلام'' کا خطاب پانے والوں میں انھوں نے اپنے استاد کا نام پیش کیا تو ان سے سوال کیا گیا کہ کیا انھوں نے کچھ کتابیں لکھی ہیں تو اقبال نے برجستہ کہا ''میں ان کی زندہ تصنیف موجود ہوں۔''[1] اس کے علاوہ اقبال نے اپنی نظموں کی زبان میں بار ہا استاد کو یاد کرتے ہوئے اپنی عقیدت مندی کو ظاہر کیا ہے۔

مذکورہ مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ شاگرد کی طبعی موزونیت اور ذہنی تربیت میں استاد کا رول کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک آتش اور ان کے معاصر ناسخ کے عہد کا سوال ہے تو ''ان کے دور میں شاعری تہذیبی زندگی کی سب سے اہم سرگرمی تھی۔ نوابین و امرا کے ہاں صیغۂ شاعری موجود تھا جس میں شعرا کو ملازم رکھا جاتا تھا۔''[2] گویا شاعر ہونا عزت کی بات سمجھی جاتی تھی اور دیگر فنون کے اساتذہ کی طرح شاعری کے بھی استاد ہوا کرتے تھے۔ اس وقت لکھنؤ اہلِ ہنر' اہلِ فن اور شعرا و فصحا سے معمور تھا۔ بقول مصحفی ''مخزنِ شعر و فصحا بنا ہوا تھا۔'' خواجہ آتش کے حریف شیخ ناسخ کے شاگردوں کی تعداد اس وقت غالباً سو (100) سے زیادہ تھی۔ وہ بڑے دنیادار آدمی تھے۔ اپنی سوجھ بوجھ اور مصلحت پرستی سے دربارِ اعلیٰ میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان کے شاگرد شاعری کی محفلوں میں شریک ہو کر اپنے فن سے ناسخ کی استادی کو ظاہر کر رہے تھے۔

اس کے برعکس آتش نے ادب کی سیاسی بساط پر مہرہ بننا کبھی پسند نہ کیا اور گزرانِ اسباب زندگی کی خاطر کبھی اپنی خودداری' شرافت اور نجابت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان کے مزاج سے واقف ہوں' جنھیں ان کا قرب حاصل رہا ہو اور خلوت و جلوت میں شرکت کرنے کا موقع ملا ہو۔ اس سلسلے میں تلامذۂ آتش خاص اہمیت رکھتے ہیں جنھیں آتش کا خاص قرب حاصل رہا اور استاد کے رنگِ سخن کو اپناتے ہوئے سلسلۂ آتش کو بقائے دوام

1۔ ذکرِ اقبال' ص۔ 11

2۔ تاریخ ادب اردو' جلد سوم' ڈاکٹر جمیل جالبی' ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی' 2007' ص۔ 670

بخشا۔ آتش نے بھی پوری طرح ان کی شخصیت کو نکھارا نیز انھیں شعری فنون کے رموز ونکات سے بھی آگاہ کیا۔ شاید آتش کا یہی خلوصِ خاص تھا کہ جب وہ بینائی سے محروم ہو گئے تو ان کے شاگردانِ عزیز ہر وقت ان کے حضور میں حاضر رہا کرتے تھے اور ہر طرح استاد کی خدمت بجالانے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ان واقعات کو باب اوّل میں رقم کیا جاچکا ہے۔ لہٰذا اس تفصیل میں نہ جا کر کہنا یہ ہے کہ تلامذۂ آتش کی ایک طویل فہرست ہے جن میں تقریباً ستّر (70)، ایسے شاعر ہوئے جنھوں نے باقاعدگی کے ساتھ آتش سے اصلاح لی اور آتش کے تلمیذ کہلانے میں فخر محسوس کیا۔

لہٰذا انھیں آتش کی تخلیق ہی سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے لکھنوی شاعری پر آتش کے نقوش مرتسم کرتے ہوئے اپنے استاد کے رنگ کو عام کیا اور لکھنؤ کے شعرا پر غلبہ حاصل کر کے پورے لکھنوی مزاج کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ اوروں کے اثرات دھیرے دھیرے کم ہوتے گئے اور اس کی جگہ آتش کی سادگئ زبان، جدّتِ طبع، مضمون آفرینی اور وارداتِ قلبی لکھنؤ میں عام ہو گئی۔ تلامذۂ آتش میں چند نام ایسے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں ان کے جانشین اور پیروؤں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ۔ میر وزیر علی صبا، نواب سید محمد خاں رند، نواب مرزا شوق، پنڈت دیاشنکر نسیم، دوست علی خلیل، خواجہ آغا حجو شرف اور واجد علی شاہ اختر وغیرہ وہ باکمال شعرا ہیں جن کی شاعری میں استاد کا رنگِ تغزّل بھی ہے اور لفظی صناعی بھی نیز عشقیہ جذبات بھی۔ ظاہری حسن بھی ہے اور باطنی کیفیات بھی ۔ گویا اپنے استاد کے وصفِ خاص کو اپناتے ہوئے ایسا کلام پیش کیا جو قلب کے لطیف تاروں کو مرتعش کرنے کی تاثیر رکھتا ہے۔ اگر چہ نسیم اور مرزا شوق کا شعری میدان مثنوی ہے اور نسیم کی مثنوی ''گلزارِ نسیم'' پر آتش کا رنگ دیکھ کر کہا بھی گیا کہ یہ آتش نے ہی کہی ہے لیکن اپنے شاگرد کے نام سے اسے منسوب کر دیا ہے۔ بہر حال اس اختلافی مسئلے میں نہ جا کر مذکورہ تلامذۂ آتش سے ایک ایک شعر پیش کرنا مناسب ہوگا کہ جس سے روایتِ آتش کی توسیع کرنے والے ان شعرا کے رنگِ سخن میں استاد کی شعری مشابہت کو تلاش کیا جا سکے۔

بیت ہستی کے صبا ہو گئے معنی روشن
خواجہ آتش سا زمانے میں جو اُستاد آیا

(صبا)

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گُل پکار، میں چلاؤں ہائے دل
(رند)

خیر سے موسمِ شباب کٹا
چلو اچھا ہوا، عذاب کٹا
(مرزاشوق)

نسیم اس چمن میں گلِ تر کی صورت
پھٹے کپڑے رکھتے ہیں پردہ ہمارا
(نسیم)

آدمی وہ ہے کہ جو حضرتِ آدم کی طرح
شیرِ مادر کا بھی شرمندۂ احساں نہ ہوا
(خلیل)

کیوں ہم کو رفتہ رفتہ لبِ گور کر گئی
ملتی کہیں تو پوچھتے عمرِ رواں سے ہم
(شرف)

ذرّۂ خاک سے بھی کم تر ہوں
کون اختر شمار کرتا ہے
(اختر)

خواجہ آتش کے تعلق سے ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے شاگردوں میں کتنے ہی لوگ ایسے تھے جن کا تعلق اسلام سے نہیں بلکہ ہندو مذہب سے تھا لیکن آتش کی سرکار میں انھیں بھی وہی اعتبار حاصل رہا جو مسلمانوں کو تھا۔ اس امر سے بھی آتش کے وسیع المشر بی اور درویشانہ مزاج کی نشان دہی کی جاسکتی ہے کہ انھوں نے قومیت کے تصوّر پر مذہبیت کی قید کو بے معنی تسلیم کیا اور انسانی زندگی سے پیار کرتے ہوئے اس تفریق کو بے حقیقت تصوّر کیا جو انسانوں کے درمیان

دیواریں کھڑی کرتی ہے۔اس معاملے میں آتش کا نظریۂ زندگی دیکھیے۔

قید مذہب کی نہیں حسن پرستوں کے لیے
کافرِ عشق ہوں میں، کوئی میرا کیش نہیں

ادبی و تخلیقی جائزہ میں قلم وقرطاس سے لے کر تخلیقِ انسان تک کا یہ وہ سفر ہے جس میں دونوں زاویوں سے خواجہ آتش کو بحیثیت تخلیق کار کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔انہی کے خیال پر اس باب کا اختتام کرتے ہیں۔

عالم جو تھا مطیع ہمارے کلام کا
کیا اسمِ اعظم اپنے دہن سے نکل گیا

تنقید وتبصرہ

ایک مشہور مقولہ ہے کہ آدمی اپنی تحریروں سے پہچانا جاتا ہے۔انگریزی زبان میں اس بات کو یوں کہا گیا ہے" .Style is The Man"اسلوب کی اس خصوصیت کے سبب ہی سخنوری کی دنیا میں میر تقی میر اپنے لہجے کی کسک، درد اور گداختگی سے پہچانے گئے۔خواجہ میر درد کی شخصیت، متوازن اور متصوفانہ افکار کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی جس کا عکس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔رنگین کی رنگینی طبع اور طرزِ ادا کو ان کے کلام کے آئینے میں دیکھا جاسکتا ہے۔مرزا غالب کی پہچان ان کا وہ لب ولہجہ ہوا جو تشکیک اور ذہنی کشمکش کے ساتھ ان کے کلام پر حاوی رہا اور یہی وصف ان کی شناخت کا سبب بنا۔اس تمہید کے بعد جب بات خواجہ آتش کی کرتے ہیں تو وہ اپنے مخصوص شیوۂ گفتار سے پہچانے جاتے ہیں۔چنانچہ یہی وہ خطوط ہیں جن کو ذہن میں رکھ کر ہمارے ناقدین اور اردو شاعری کے مورخین نے مذکورہ شعرا کی شاعرانہ اہمیت اور شعری سرمائے پر اپنی فہم کے مطابق، اظہارِ خیال کیا ہے۔

اس باب میں خواجہ آتش جیسے صاحبِ سخن کے کلام پر تنقید وتبصرہ مقصود ہے۔ان کے کلام پر ابھی تک نہ تو مکمل طور سے تنقید ہی ہوئی ہے اور نہ تجزیاتی نقطۂ نظر سے تمام عناصرِ شعری سے بحث کی گئی ہے۔لہٰذا تنقید سے پہلے اس خیال کی وضاحت ضروری ہے کہ آتش اور لکھنؤ لازم وملزوم

ہیں ۔لکھنؤ ایک قدیم شہر ہی نہیں بلکہ اپنی تہذیب و معاشرت کا گہوارہ بھی رہا ہے جونشست وبرخاست، گفتاروکردار، طرزِ تکلّم، وضع قطع، رہائش ورہن سہن، قوانینِ دوستی، آدابِ زندگی، علمیت وادبیت، شاعری ومصوّری میں منفرد رہا ہے ۔اس شہر میں مصحفی، انشا، رنگین اور جرأت کی سرپرستی میں شعرا کی ایک نئی نسل لکھنؤ کے شعری افق پرنمودار ہوئی جس میں آتش اور ناسخ دو بڑے نام ہیں۔ان دونوں کے ذریعے ہی دبستانِ لکھنؤ کی شناخت قائم ہوئی۔اورشاعری کی دنیا میں دونوں ہی اپنے مشقِ سخن سے مشہور ہوئے ۔ دونوں نے غزل کے دور رجحانات کی نمائندگی کی ۔ ہیئت و مضمون سے لے کر زبان کی بہت سی نزاکتوں کے مشترکہ امین رہے ۔ دونوں کا زمانہ، ماحول اور شعری میدان غزل ہی تھا اس لیے لکھنؤ اسکول کے روح رواں کی حیثیت سے ناقدین نے آتش کو، اور کچھ نے ناسخ کو اہم جانا ۔ اصلاحِ زبان کی حیثیت سے یقیناً ناسخ نے بڑا کام انجام دیا اور صرف ونحو کی روشنی میں زبان کوصحت کے ساتھ استعمال کرنا سکھایا۔

آتش نے بھی ناسخ کے قواعدی عمل کو اپنایا۔قافیہ پیمائی میں ناسخ کی پیروی بھی کی ۔ لیکن زبان کے استعمال میں ان کے فطری انداز، بول چال کی زبان اور محاورے کی شان نے انھیں منفرد مقام عطا کیا جس میں استاد مصحفی کی سادہ گوئی کے اثر کو بڑا دخل ہے ۔ان کا فن سرتاسر لکھنوی ہے مگر فکر میں دہلی اور لکھنؤ کی دھوپ چھاؤں ملتی ہے ۔اسی لیے مرزا غالب کو ان کے یہاں ناسخ سے زیادہ نشتریت کا گمان ہوتا ہے ۔آتش نے اپنے منفرد فکری رجحان سے غزلیہ شاعری کے دامن کو وسعت ہی نہیں بخشی بلکہ نئی کثیر الجہت فنی خوبیوں سے بھی دبستانِ لکھنؤ کو مالا مال کیا ہے چنانچہ ۔

برنگ غنچہ پژ مردہ دل گرفتہ چلے
شگفتہ ہو کے نہ دو دن بھی ہم نے یاں کاٹے

آنکھوں سے جائے اشک ٹپکنے لگا لہو
آتش جگر کو دل کی مصیبت نے خوں کیا

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجیے

تنہائی ہے غریبی ہے صحرا ہے خار ہے
کون آشنائے حال ہے کس کو پکاریئے

آتش اور ناسخ دبستانِ لکھنؤ کے دو اہم ستون ہیں۔تاہم دونوں اپنے طرزِ خاص اور فکری احساس کی بنا پر جداگانہ نظر آتے ہیں۔گویا دونوں نے مختلف مکتبۂ فکر وفن کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنی حیثیت کو منوایا ہے۔اگر شیخ ناسخ نے شاعری میں عالمانہ انداز اختیار کیا اور بحرالعلوم مشہور ہوئے تو آتش نے اپنے فقیرانہ مزاج کی صوفیانہ آواز سے علم کو ''حجابِ اکبر'' تصوّر کیا اور فقر و غنا کے مضامین بکثرت باندھے۔

> ''اس لیے ان کی غزلوں میں بانکپن اور آزادی و جانبازی اور شجاعت کے مضامین بخوبی ادا ہوئے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ آتش ایک فطری شاعر تھے جنھوں نے کسی کی مدح میں کبھی قصیدہ لکھا نہ تخت نشینی کی تاریخ کہی، نہ مثنوی نہ رباعی، نہ قطع، نہ سلام، نہ مرثیہ۔مگر غزل گوئی کے بادشاہ تھے۔پرانی غزل گوئی کا رنگ بدل گیا اور ادائے مطلب میں نمایاں ترقی کی جوان کے کلام سے ظاہر ہے۔''1

غزل کی شاعری داخلی اور خارجی دونوں طرح کے مضامین کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔داخلیت غزل کا وصفِ خاص ہے۔دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے زیرِ بحث اکثر داخلیت اور خارجیت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھنؤ کی شاعری کو ہلکے پن، بدمستی و سرمستی، عیاشی واوباشی تک محدود رکھا گیا ہے۔اس معاملے میں دہلی اور لکھنؤ کے معاشی ومعاشرتی حالات کو بڑا دخل رہا ہے کہ زمانے کی افراتفری اور حالات کے انتشار سے دہلی والوں کو درد وسوز سے دو چار ہونا پڑا جس کا عکس ان کے کلام میں بھی ملتا ہے۔اس کے برعکس لکھنؤ کی اطمینان بخش پرکیف

1۔ آتش: عہد اور شاعری، ڈاکٹر محمد حیات الدین، کتابی دنیا دہلی، 2013، ص۔267

فضا نے شاعری کا دامن نشاطیہ رنگ و آہنگ سے بھرا۔لکھنؤ پہنچ کر آتش نے بھی یہی ماحول پایا لیکن استاد کی صحبت، ناسخ کی اصلاحِ زبان کی تحریک اور خود اپنے مخصوص مزاج کے تحت انھوں نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ جو زندگی کی حرارت اور عزم سے بھرپور تھا جس میں خوددار انسان کی خودداری بھی تھی اور ماحول کی پروردہ، شخصیت کی سرکشی بھی۔ یہ وہ اوصاف ہیں جسے اردو شاعری میں صرف آتش ہی کا حصّہ کہہ سکتے ہیں۔اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نامرد آسماں سے گوارا ہے کس کو جنگ
آتش سپر کو چیر پے تلوار توڑیے

وہ گرم رو بادیۂ عشق و جنوں ہوں
جلتا ہے چراغ آج مرے نقشِ قدم سے

گویا اس آن بان شان، شجاعت و مردانگی اور سرکشی نے ہی اردو شاعری میں ان کی انفرادیت کی مہر ثبت کی۔واضح ہو کہ یہ

''نہ تو محض ایک شاعر کی آواز ہے نہ رند کی اور نہ صوفی کی۔ یہ ایک البیلے سپاہی کی آواز ہے جس کی شخصیت کے اندر شاعر، رند اور صوفی بھی ہے۔اس آواز میں کبھی سب آوازوں کا ملاپ بھی ہے کبھی علاحدہ سے بھی ایک گونج سنائی دیتی ہے۔''1

اگرچہ غزل کی شاعری موضوعاتی اعتبار سے یکسانیت کا فن ہے۔اس میں شروع ہی سے حسن وعشق، انسانی درد وغم، نشاط و سرور، ہجر و وصال، حسرت و آرزو، رقیب و رفیق وغیرہ ایسے مضامین رہے ہیں جو تمام شعرا کے یہاں عمومیت کا درجہ رکھتے ہیں۔اصل میں کہی ہوئی بات کو دوہرا دینا کسی طور جاذبیت نہیں رکھتا بلکہ غزل کی شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شراب جیسی بھی ہو لیکن، مختلف رنگین پیمانوں میں پیش کرنے کا نام غزل کی شاعری ہے۔یعنی احساس کی تازگی کے ساتھ ''ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا طریقہ ہی کسی شاعر کو انفرادیت بخشتا ہے۔لہٰذا

1۔ مقدمۂ کلامِ آتش، خلیل الرحمن اعظمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2008، ص۔42

آتش کی پرورش اور پرداخت، مخصوص افتادِ طبع اور جذبۂ آزادی و سرشاری نے انھیں ہر ماحول و حالات سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے جینے کا ہنر عطا کیا اور ان کی آواز کو ایک ایسا مردانہ لہجہ دیا جس کی گونج ان کی شاعری میں اس طرح سنائی دی۔

پھر گئے ہیں معرکوں میں مجھ سے تلواروں کے منھ
سخت جانی نے مری توڑے ہیں خنجر سیکڑوں

زیرِ دیوار جو ٹھہروں تو حسد سے مرے
سایہ سر پر سے دبے پاؤں رواں ہوتا ہے

لکھنؤ کی معاشرت میں جب ناسخ کی تازہ گوئی اور طرزِ جدید نے جذبہ و احساس کی شاعری پر قدغن لگا کر مضمون آفرینی، بلند پروازی اور نازک خیالی پر نئی شاعری کی بنیاد رکھی اور خارجیت کو معیارِ سخن تصور کیا کہ جس میں ''حسن'' نے ''عشق'' کی جگہ لے کر ظاہری رنگ و روپ کو خوب خوب مشقِ سخن بنایا۔ آتش نے بھی ناسخ کی ہم نوائی کی جسے لکھنؤ کا صحت منداثر کہنا چاہیے، لیکن مصحفی کی سادہ گوئی اور اپنے فطری میلانِ طبع سے وادیٔ حسن میں بھی ایک مصوّر کی حیثیت اختیار کی، اور کہہ اٹھے۔

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ، کارخانہ ہے خدائی کا

آتش کے یہاں حسن کی تصویر کشی میں احساس کے رنگ کو خاص دخل ہے۔ وہ عشقیہ جذبات کے اظہار میں گریہ وزاری سے کام نہیں لیتے بلکہ زندگی کی حرکت و حرارت باقی رکھنے کے لیے عشق کو ضروری تصوّر کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں عشقیہ شاعری کا جو رنگ و روپ ہے اسے اردو شاعری میں اضافہ سمجھنا چاہیے۔ بقول فراق گورکھپوری۔ ''ان کی عشقیہ شاعری میں ایک ہمک ایک لہک پائی جاتی ہے۔ وہ عشق کو ایک جان لیوا روگ بنا کر پیش نہیں کرتے۔ ان کے یہاں عشق زندگی کی امنگ بن کر نظر آتا ہے۔ آل احمد سرور کی نظر میں آتش کے یہاں عشق ایک شراب ہے، ایک خوشبو ہے، ایک چاندنی ہے، ایک رقص و وجد کی شے ہے۔ یہ عشق ماورائی نہیں ہے۔ اس

میں جسم کی آنچ، اعضا کا نقشِ جمیل وزخم کی مہک، جذبے کی گرمی اور ذوق وشوق کی لذّت ہے۔ آتش اردو کے پہلے عاشقِ سرشار ہیں۔ نقادوں نے ان کے یہاں حافظ کا سا جوش اور وجد وکیف محسوس کیا ہے، وہ اسی وجہ سے ہے۔ میرے نزدیک آتش کے یہاں حسن کی مصوّری اور عشق کی کیفیات کی نقاشی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اس وجہ سے ان کی شاعری احساسی (Sensous) ہے۔" [1]

زبان شعر میں نمونۂ عشق دیکھیے۔

کوچۂ دلبر میں میں، بلبل چمن میں مست ہے
ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے

کیے ہیں شکر کے سجدے جفائے یار پر کیا کیا
رہا ہے دل مرا راضی رضائے یار پر کیا کیا

دراصل زندگی کے خوشگوار لمحات کو مختلف رنگوں میں پیش کرنا نسبتاً آسان ہے مگر اس آسان کام کے لیے آتش کی طرح اظہار پر قدرت ہونا ضروری ہے۔ ان کے مخصوص لہجے، خاص تیور، صحت مند خارجیت اور زندگی کا امید افزا نقطۂ نظر، جو ہر گام پر نعرۂ مستانہ کا درجہ رکھتا ہے ان کی شاعری کو "چیز دگر" بنا دیتا ہے۔ آتش کی شاعری کا یہ رنگِ سخن لکھنوی تہذیب کی روحِ لطیف کا ترجمان ہے اور لکھنوی شاعری میں یہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ آتش کے کلام پر خارجیت کے اثرات سے بحث کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی کہتے ہیں۔

> "ان کے بہترین کلام پر بھی خارجیت کا رنگ بہت گہرا ہے لیکن یہ خارجیت اس خارجیت سے بہت مختلف ہے جس کے لیے اہلِ لکھنؤ بدنام ہیں اور جس میں جذبات واحساسات اور زندگی کے گہرے تجربات کا سر رشتہ چھوڑ کر شاعر لفظی بازی گری، ایہام گوئی، ضلع جگت اور فنی وعروضی موشگافیوں میں لگ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ آتش کی خارجیت ایک صحت مند

1۔ تمہید۔ آل احمد سرور، مقدمہ کلامِ آتش، 2008، ص۔xvi

خارجیت اور ایک فطری میلان ہے جس کا سبب لکھنؤ کا وہ ماحول ہے جہاں شکست و ریخت اور مایوسی و نامرادی کے بجائے زندگی میں پُر امید نقطۂ نظر نے لے لی ہے۔۔۔۔۔ ۔۔۔ اسی لیے آتش کی خارجیت کو فطری خارجیت اور لکھنؤ اسکول کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھا جائے تو مناسب ہوگا۔ ان کا کلام لکھنؤ کی شاعری کی ترقی پذیر اور تکمیل یافتہ شکل ہے۔ جس نے اردو غزل گوئی کے امکانات کا جائزہ لیا۔'' 1؎

لہٰذا اردو شاعری میں آتش کی طرزِ خاص نے ماورائیت کے بجائے ارضیت سے اپنا رشتہ استوار کیا اور انسانی حواس کی اس تسکین کا سامان فراہم کیا ''جو ابھی تک تشنہ تھے اور جن کی تشنگی ہم سے قوتِ حیات چھین لیتی ہے۔'' اردو شاعری میں اس اعتبار سے آتش کی آواز کو ایک نیک شگون کہنا چاہیے کہ جس نے اس عہد کے عام غزل گویوں کی حزنیہ لے کے سامنے رنگا رنگ زندگی کا مظاہرہ کیا۔ اپنے دل نشیں اشعار سے سوتوں کو جگایا اور روحِ انسانی کو بیدار کیا۔ نیز اردو شاعری کے افق کو وسیع کیا۔ اسی لیے آتش کا نام میرؔ، سوداؔ اور غالبؔ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

بیشتر اہلِ علم و فن اور اہلِ نظر حضرات نے آتش کے کلام کو تنقید کی خراد پر چڑھا کر اسے جانچا و پرکھا ہے اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اردو غزل کا اہم استاد تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ تنقید نہ بت پرستی کا عمل ہے نہ بت شکنی کا۔ یہ دودھ سے پانی کو الگ کرنے کا عمل ہے۔ آبِ حیات میں محمد حسین آزاد نے خواجہ آتش کی علمی استعداد اور ادبی محفلوں میں ان کی شمولیت کو یوں بیان کیا ہے کہ

''خواجہ صاحب کی ابتدائی عمر تھی اور استعدادِ علمی تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ طبیعت مشاعروں میں کمال دکھانے لگی۔'' 2؎

اس بیان میں تین باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک ابتدائی عمر سے محمد حسین آزاد کا کیا مطلب ہے؟ کیا ابتدائی شعری مذاق کی طرف اشارہ ہے یا اُنتیس (29) سالہ نوجوان کو مکتب کا

1۔ مقدمۂ کلامِ آتش، خلیل الرحمٰن اعظمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2008، ص۔50

2۔ آبِ حیات، محمد حسین آزاد، سنہ اشاعت نامعلوم، ص۔40

مبتدی کہنا چاہتے ہیں؟ دوسرا نکتہ' استعدادِ علمی پوری نہ ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا کم پڑھے لکھے ہونے کی طرف اشارہ ہے یا شعری فن میں پختہ کار نہ ہونے کی بات کر رہے ہیں؟ آخری بات' طبیعت کا مشاعروں میں کمال دکھانا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب علمی استعداد نہ تھی تو طبیعت مشاعروں میں کس طرح کمال دکھانے لگی؟ کمال دکھانے اور علمی لیاقت کی دلیل میں ایک واقعہ یوں سامنے آیا ہے کہ۔

''میر تقی میر کے ہاں مشاعرہ تھا آتش نے غزل پڑھی جس میں شکم کے مضمون میں ''موجِ بحر کافور'' باندھا تھا۔ طالب علی خاں عیش نے وہیں ٹوکا۔ تو آتش نے جواب دیا کہ میاں بہت مدّت چاہیے' دیکھو تو سہی جامی کیا کہتا ہے۔'' اور پھر فارسی شاعر جامی کا مصرع پڑھا۔''1

''حبابے خاستہ از بحر کافور''

آتش کی عربی فارسی دانی اور علمی واقفیت کا اعتراف تو یوں بھی کرنا جائز ہے کہ خود استاد مصحفی نے کہا تھا کہ ابتدا میں طبیعت ''فارسی کی طرف زیادہ مائل تھی۔'' لیکن بعض لوگ ان عربی فارسی الفاظ پر اعتراض کرتے ہیں جن کو آتش نے محاورہ اہلِ عرب وعجم کے موافق نہیں باندھا ہے۔ مثلاً۔

دخترِ رز میری مونس مری ہمدم ہے
میں جہاں گیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

اس شعر پر یہ اعتراض کیا گیا کہ بیگم ترکی لفظ ہے۔ آتش نے اس کا جواب یوں دیا کہ جب ترکی بولیں گے تو اس کا تلفظ پیش کے ساتھ کریں گے لیکن زبانِ اردو میں یوں ہی استعمال ہونا چاہیے۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آتش کا مطالعہ وسیع تھا اور وہ خاصی علمی لیاقت رکھتے تھے۔ ساتھ ہی زبان کی فنی نزاکتوں سے بھی واقف تھے۔ لہٰذا الفاظ کا صحیح' برجستہ استعمال' زبان کی باریکیوں کو آتش کی بدولت قبولِ عام کی سند حاصل ہوئی اور انہی خصوصیات کی بنا پر ان کی شاعری

1۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی'' ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی' 2008' ص۔ 173

اپنے عہد کی شاعری نہ ہوکر ہر عہد کی شاعری قرار پائی۔ نیز جاندار قوتِ تخیّل اور گہری زود حسی کے سبب، کل بھی انسانی ذہن کو متاثر کیا اور آج بھی کر رہی ہے۔

''اگرچہ آتش کے کلام میں لکھنؤ کی مروجہ شاعری اور طرزِ ناسخ کی بے اعتدالیاں بھی کافی مقدار میں ہیں لیکن لکھنؤ اسکول کی اس مشترکہ روایت سے آتش کے شاعرانہ مزاج کو جو بات علاحدہ کرتی ہے ان کا بہت کچھ پتہ ان بحثوں سے چل سکتا ہے۔'' جس نے ناسخ و آتش کی معاصرانہ چشمک اور مشاعروں کی نوک جھونک کو کہانی کی شکل دی ہے۔ سب سے پہلے محمد حسین آزاد کی حکایتی تحریر دیکھیے۔

> ''وہ (آتش) شیخ امام بخش ناسخ کے ہم عصر تھے۔ مشاعروں اور گھر بیٹھے روز مقابلے رہتے تھے۔ دونوں کے معتقد انبوہ درانبوہ تھے جلسوں کو معرکے اور معرکوں کو ہنگامے بناتے تھے۔ مگر دونوں بزرگوں پر صدرحمت ہے۔ مرزا رفیع اور سید انشا کی طرح دست و گریباں نہ ہوتے تھے۔ کبھی کبھی نوکا جھونکی ہو جاتی تھی کہ وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے جب شیخ صاحب کی غزلوں پر متواتر غزلیں لکھیں تو انھوں نے کہا۔
>
> ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب
> بومسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب [1]''

دونوں معاصرین کے درمیان کا ایک دوسرا واقعہ محمد حسین آزاد یوں لکھتے ہیں کہ ایک مشاعرہ کی محفل میں ناسخ اس وقت پہنچے کہ جب جلسہ ختم ہو چکا۔ آتش اور دیگر شعرا وہاں موجود تھے۔ یہ جا کر بیٹھے۔ تعظیم رسمی اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ جناب خواجہ صاحب مشاعرہ ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سب کو آپ کا اشتیاق رہا۔ تب شیخ صاحب نے یہ مطلع پڑھا۔

جو خاص ہیں وہ شریک گروہ عام نہیں
شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

1۔ اردو کے ادبی معرکے، ڈاکٹر محمد یعقوب عامر، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، 1982، ص۔112۔111

چونکہ نام بھی امام بخش تھا اس لیے تمام اہلِ جلسہ نے خوب تعریف کی ۔لیکن خواجہ صاحب نے یہ مطلع ان کے جواب میں پڑھا۔

یہ بزم وہ ہے کہ لا خیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفہ میں بازیٔ غلام نہیں

لیکن تحقیق بتاتی ہے کہ پہلا مصرع آتش نے طالب علی عیش کے حق میں کہا تھا لیکن یار لوگوں نے اسے دونوں کی صفتِ معرکہ سے جوڑ دیا ۔آزاد نے ایک نواب صاحب کے یہاں مشاعرہ کی منظر کشی کرتے ہوئے ایسا واقعہ بیان کیا ہے جسے چشمک کا نقطۂ عروج کہا جاتا ہے ۔وہ یہ ہے کہ نواب صاحب کی طرف سے آتش کو مصرع طرح اس وقت بھیجا گیا جب مشاعرے میں ایک دن باقی تھا ۔خواجہ صاحب بہت خفا ہوئے ۔۔۔۔۔۔۔۔شہر کے باہر چلے گئے ۔ پھرتے پھرتے ایک مسجد میں جا بیٹھے ۔وہاں سے غزل کہہ کر لائے اور مشاعرے میں گئے تو ایک قرابین بھی بھر کے لے گئے اور بیٹھے بھی تو عین مقابل شیخ صاحب ۔اوّل تو آپ کا انداز ہی بانکے سپاہیوں کا تھا اس پر قرابین بھری سامنے رکھی تھی ۔معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہیں ۔بار بار قرابین اٹھاتے اور رکھ دیتے تھے ۔ جب شمع سامنے آئی تو سنبھل کر ہو بیٹھے اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کر کے پڑھا۔

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

''اس ساری غزل میں ان کے لے پالک ہونے پر' کہیں ذخیرۂ دولت پر' کہیں ان کے سامانِ امارت پر غرض کچھ نہ کچھ چوٹ ضرور ہے ۔شیخ صاحب بیچارے دم بخود بیٹھے رہے ۔نواب صاحب ڈرے کہ خدا جانے یہ ان پر قرابین خالی کر دیں' میرے پیٹ میں آگ بھر دیں' اسی وقت داروغہ کو اشارہ کیا کہ دوسرا خلعت خواجہ صاحب کے لیے تیار کرو ۔غرض دونوں صاحبوں کو برابر خلعت دے کر رخصت کیا۔''[1]

1۔ بحوالہ اردو کے ادبی معرکے' ڈاکٹر محمد یعقوب عامر' ترقی اردو بیورو نئی دہلی' 1982 'ص ۔129

آزاد نے پندرہ اشعار پر مشتمل اس غزل کا جس طرح تعارف کرایا ہے اس میں کہیں بھی شیخ ناسخ کی ذات پر چوٹ یا ان کے لے پالک ہونے کے اشارے کسی شعر میں بھی نہیں ملتے۔ بلکہ پوری غزل آتش کی اپنی دل شکستگی اور دل خراشی کی آئینہ دار ہے۔

دراصل یہ وہ زمانہ تھا کہ جب لوگوں کے سامنے مصحفی اور سید انشا کے معرکے لکھنوی حضرات کے دلوں کو گدگداتے بھی تھے اور موضوع گفتگو بھی بنے ہوئے تھے۔ لہٰذا ناسخ اور آتش کو بھی لوگوں نے ایک دوسرے کا حریف بنایا اور ان کی معاصرانہ شکر رنجی کے ذکر میں بعض قصّوں اور طرحی غزلوں سے ایسے اشارے برآمد کر لیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صرف ایک دوسرے پر چوٹیں کرنے کے لیے ہی بیٹھے تھے۔ لیکن اس معرکہ آرائی کی تصدیق یوں نہیں ہوئی کہ ناسخ و آتش نے ایک دوسرے کی کوئی ہجو نہیں لکھی۔ ''ناسخ اپنے شاگردوں کو دوسروں کے شعر پر اعتراض کرنے سے منع کرتے تھے۔''[1] یہ ایک الگ بات ہے کہ ناسخ کی زمانہ ساز طبیعت نے سوسائٹی میں بلند مرتبہ حاصل کر لیا تھا جو آتش کے قلندرانہ مزاج سے بعید تھا۔ قریب الفہم ہے کہ اس وجہ سے دونوں میں معاصرانہ چشمک رہی ہو، جو مقتضائے فطرت بھی ہے اور لازمۂ زندگی بھی۔ صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ان باتوں کے بغیر زندگی کا لطف بھی نہیں۔ اگر یہ معاملات نہ ہوں تو زندگی، ہم ہی ہم اور تم ہی تم والی کیفیت تک محدود ہو کر رہ جائے۔

لہٰذا یہ حقیقت ہے کہ معاصرین سے اپنے وجود کی بقا کو خطرہ ضرور لاحق ہوتا ہے لیکن یہ خطرے اور خدشات ہی گرمیٔ تحریک کا سبب بن کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ کا حوصلہ و ہمّت بخشتے ہیں۔ لیکن آتش کی رشک و رقابت نے کبھی زوالِ انسانی کے حدود کو پار نہیں کیا۔ ہاں! اتنا ضرور ہوا کہ حالات و زمانے کا رخ دیکھ کر گوشہ نشین ہوئے مگر قنوطیت اور حوصلہ شکنی کے جذبات کو اپنے قریب نہ آنے دیا۔ کیونکہ زندگی سے پیار کرنے والے اور حوصلہ مندی سے جینے والے ہی یہ کہہ سکتے ہیں۔

سر شمع سا کٹائیے پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے

1۔ تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2007، ص۔725

اس سچائی کو تسلیم کرنا ہی چاہیے کہ ہر شخص اپنی عادت، طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور یہی انفرادیت ہر شخص کی پہچان ہوتی ہے۔ اگر آتش کی شعری پہچان سادہ گوئی، رعنائی، سرشاری و سرمستی ہے تو ناسخ کے یہاں ثقیل الفاظ کا استعمال، مبالغہ آرائی، مضمون آفرینی، خارجیت اور فارسیت کی بھرمار ہے۔ گویا دونوں اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے الگ ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آتش کہتے ہیں۔

ہر شب، شب برات ہے، ہر روز روزِ عید
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کر

تو ناسخ کا خیال یہ ہے۔

ہر روز روزِ ہجر ہے، ہر شب شبِ فراق
نفرت ہوئی یہاں کے سفید و سیاہ سے

محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' پانچویں دور کے بیان میں ناسخ کے ساتھ آتش کو بھی لکھنؤ اسکول کا اہم نمائندہ بتایا ہے۔ ان کے کلام سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے وہ اعتراضات بھی درج کیے ہیں جو آتش کی طرف سے ناسخ پر اور حامیانِ ناسخ کی طرف سے آتش پر وارد کیے گئے ہیں اور دونوں کی موشگافیوں، معرکہ آرائیوں اور حریفانہ تیراندازیوں سے اپنے دور کے ان دو حریفوں کی داستانِ نزاعی اور علمی و شخصی تکرار کو ایسا حکایتی و افسانوی پیرائے بیان عطا کیا کہ قصّۂ آدم نے احوالِ واقعی کا لباس زیبِ تن کر لیا۔ آبِ حیات کے فیصلوں کا عکس ہمارے تنقیدی افکار پر بھی پڑا ہے جس کی نمائندہ مثالیں ہمارے تذکروں کی زینت بن چکی ہیں اور آزاد کی رنگ آمیزیٔ بیان کا سہارا لے کر انھوں نے بھی آزاد ہی کی عینک سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ تنقید سرسری مطالعہ اور غیر محکم نظریہ کا عمل نہیں اور نہ صرف بندھے ٹکے اصولوں اور کہی سنی رائے سے تنقیدی منصب کے فرائض انجام دیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے یہاں تنقید نگاری کا عمل حالی سے شروع ہوتا ہے اور اصولِ تنقید کی باقاعدہ پہلی کتاب کا درجہ ''مقدمہ شعر و شاعری'' کو حاصل ہے۔ جب لکھنوی فکر و فن کے اثرات سے شاعری کی دنیا خارجیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی تو حالی نے اردو غزل کو نشانۂ ہدف بناتے ہوئے اس

زمانے کی شاعری سے بیزاری کا اظہار کیا کیونکہ وہ شاعری میں اخلاقی اور تعمیری نقطۂ نظر کے حامی تھے جو زندگی کو حقیقت کا آئینہ دکھا سکے۔ چنانچہ بقول آل احمد سرور۔

''حالی کے بعد کے تذکرہ نویسوں اور نقادوں نے لکھنؤ اسکول کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اگرچہ آتش کے تغزل کو برابر سراہتے رہے۔ مگر آتش کی خوبیوں کو پوری طرح اُجاگر نہ کر سکے۔ آزاد' حالی' امداد امام اثر' عبدالحئی' عبدالسلام ندوی آتش کے تغزل کے معترف ہیں مگر ان میں سے کسی کو ان کی عظمت کا پورا احساس نہیں ہے۔''1

آل احمد سرور کا خیال ہے کہ آتش کے کردار کی عظمت کے زیر اثر اگر ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو شاید پورے آتش کی تلاش وجستجو میں کامیابی حاصل ہو۔ دراصل کوئی بھی فنی کارنامہ خود انسان کی شخصیت اور کردار کا غماز ہوتا ہے جس میں اس کے ماحول' مزاج اور حالاتِ زمانہ کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ تو آتش کی شاعری بھی زندگی سے ہم آہنگ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں سماج اور سماجی رویوں کے ساتھ ان کے کردار کی عظمت کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ شعر انسان کی بہترین دماغی تحریکات کا نتیجہ ہوتا ہے جو اپنے پڑھنے والے سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی شفافیت کی تہہ میں جا کر ان عناصر یا عوامل کو متعین کرنے کی کوشش کرے جسے سہولتِ بیان میں تفکر کا نام دے سکتے ہیں۔ آتش کی شاعری کا مطالعہ اپنے پڑھنے والے کو اس خیال کا پابند کرتا ہے کہ ان کی شاعری جذبہ واحساس کی وہ شاعری ہے جو رجائیت اور زندگی کی قوت سے لبریز ہے اور انسان کی قوت اور عظمتِ آدم کا احساس دلاتی ہے۔ اسی لیے ''اردو غزل کی تاریخ میں آتش پہلا شاعر ہے جس کے یہاں ہم زندگی کے بارے میں ایک اثباتی نقطۂ نظر پاتے ہیں۔''2 جو انسان کو اس کی شجاعت' جواں مردی اور طاقت کے احساس سے آگاہی بخشتا ہے۔ آل احمد سرور کا خیال ہے کہ۔

''ان (آتش) سے اردو شاعری میں نشاطِ زیست کی لے بڑھی اور مردانگی کا لہجہ ابھرا۔ ہر دور میں ان کا اثر ملتا ہے اور انیس'

1۔ مقدمۂ کلام آتش، خلیل الرحمٰن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2008، ص۔42

2۔ مقدمۂ کلام آتش، خلیل الرحمٰن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2008، ص۔54

چکبست اور یگانہ کے نام اس اثر کی ضمانت ہیں۔''[1]

یقیناً آتش کا لہجۂ مردانہ لکھنوی تہذیب کے اس مثبت پہلو کا نتیجہ ہے جس پر ہمارے اہلِ علم وفکر نقادوں کی نظر پوری طرح نہیں گئی۔[2] ایک طرف اگر وہ ناسخ کے طرزِ جدید اور لکھنؤ کے تہذیبی مزاج کے پاسدار ہیں تو دوسری طرف ان کی شاعری روحِ لطیف کے اس فن سے عبارت ہے جس میں فکر وخیال اور جذبۂ احساس نے زندگی کے حقائق سے اپنا رشتہ جوڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آتش کی ندرتِ ادا اور تازگیٔ بیان نے ان کے متعدد اشعار کو ضرب المثل بنا دیا ہے۔ مثلاً

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

یہ وہ اشعار ہیں جنھوں نے ہر دور میں انسان کو متاثر کیا ہے اور ہر کس و ناکس کے اپنے ہی حالات' زمانہ اور کیفیتِ قلبی کے ترجمان معلوم ہوتے ہیں۔ آتش ایک دوربین اور وسیع النظر شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں ان کا عہد سانس لے رہا ہے وہیں زندگی کی باطنی حقیقتیں بھی بار بار سر اُٹھاتی ہیں۔ ان کی شاعری تخلیقی عمل کے چار مدار مثلاً۔ خیال' فکرِ رنگیں' بندشِ الفاظ

1۔ تمہید مقدمۂ کلامِ آتش، خلیل الرحمٰن اعظمی، قومی کونسل، نئی دہلی، 2008، ص۔ xxii

2۔ تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، 2007، ص۔ 728

اور مرصع سازی پر گھومتی نظر آتی ہے اور ان چاروں مدار میں بھی وہ ''خیال'' کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ لہٰذا یہی وہ طریقۂ فکر ہے جو انھیں اپنے عہد کے دیگر شعرا میں ممتاز کرتا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے تذکرہ شعرالہند میں آتش کے فنی محاسن کو سراہتے ہوئے شیخ ناسخ کے مقابلے میں انھیں ترجیح دی اور ان کے کلام کی خوبیوں پر حسبِ ذیل طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔

1۔ خواجہ کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے ۔ اشعار رواں اور بندشیں چست ہیں اور مضامین میں شوخی، رنگینی اور رعنائی پائی جاتی ہے۔

2۔ ہماری شاعری میں رندانہ مضامین میں خواجہ حافظ جیسا جوش اور سرمستی کا اظہار صرف خواجہ آتش کی ہی زبان سے ہوا ہے۔

3۔ کلام میں فقیرانہ اور آزادانہ شان پائی جاتی ہے۔

4۔ خارجی مضامین ان کے کلام میں بھی ہیں لیکن جب وہ حلقۂ ہائے گیسو سے نکل کر جذبات کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی شاعری عشق و محبت کے رموز و اسرار کا آئینہ بن جاتی ہے۔

5۔ خارجی مضامین سے اگر چہ دیوان بھرا پڑا ہے مگر ان کو بھی اپنی طرزِ ادا سے دلچسپ اور لطیف بنا دیتے ہیں۔

6۔ تشبیہات میں ایک لطافت آمیز سادگی پائی جاتی ہے۔

آتش کے یہاں عشق کا تصور بھی بڑا نرالا ہے جو خیالی نہیں بلکہ گوشت پوست کے انسان کا عشق ہے جسے انسانی زندگی کے ایک خلاق جذبہ کا نام دینا ہوگا جو جسم اور روح کا حصّہ بن کر ساتھ ساتھ چلتا ہے ۔ یوں سمجھیے کہ ان کے یہاں اگر حسن جسم ہے تو عشق روح ۔ اس لیے حسن کے بغیر عشق کا تصور بے معنی ہے۔ واضح ہو کہ اس میں ''جرأت کی طرح لذت پرستی نہیں بلکہ آدم اور حوا کی محبت اور پاکیزگی محسوس کر سکتے ہیں۔

آتش کے شعری رنگوں میں عاشقی کا رنگ سب سے گہرا ہے جس کو ان کے دونوں دواوین میں کثرت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اس عاشقی کی کوکھ سے وہ اخلاقی شاعری جنم لیتی ہے جس میں تصوف کا رنگ غالب تھا۔ واضح ہو کہ انھوں نے تصوف کو یوں نہیں اپنایا کہ زندگی کے باقی

رنگ پھیکے پڑ جائیں۔ وہ عملاً صوفی تو نہ تھے مگر عملی زندگی کے کچھ عناصر ضرور ایسے تھے۔ مثلاً۔ قناعت پسندی، گوشہ نشینی، وسعتِ نظر، صفائی قلب، توکل، انسان دوستی، وسیع المشر بی اور استغنا وغیرہ جس نے خالق ومخلوق اور حیات وکائنات کے بارے میں غیور مطالعہ کی دعوت دی اور انھیں صوفی شعرا کے ہم مزاج و ہم خیال بنا دیا۔ لہٰذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں شعری رنگوں کی ایسی ہم آہنگی ہے جس میں کوئی رنگ بے جوڑ معلوم نہیں ہوتا اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے نزدیک زندگی مختلف رنگوں کا مجموعہ تھی۔ اس بابت ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال یہ ہے۔

> ''اس دور کی لکھنوی شاعری میں تصوف کا اثر بہت کم نظر آتا ہے لیکن آتش نے اپنی شاعری میں تصوف کا چراغ روشن کر کے اپنی تخلیقی توانائی سے باطنی واردات کے چراغ جلائے اور اردو شاعری کو ایک ایسا رُخ دیا جو دورِ ناسخ کے لیے وقت کی راگنی نہیں تھا۔ آتش کے کلام میں جو توانائی اور عارفانہ وجدان نظر آتا ہے اس کا مخرج ومنبع تصوف ہے۔ اس دور میں آتش کی شاعری وہ چراغ ہے جس نے اس دور کے باطن کو روشن کیا اور اس کی خارجیت میں داخلیت کا عنصر شامل کر کے اس کے توازن کو برقرار رکھا۔ اگر اس دور سے آتش کی شاعری کو خارج کر دیا جائے تو آج اس دور کی اہمیت نہ صرف باقی نہیں رہتی بلکہ معلوم ہوگا کہ بنجر زمین میں ایک ہی طرح سے بار بار ہل چلایا جا رہا ہے۔ آتش کی شاعری کے بغیر یہ دور تکرار و اعادہ کا دور بن کر رہ جاتا ہے۔ لکھنؤ کے اس ماحول میں جو وہاں تھا، آتش کی آواز ایک نئی آواز ہے۔'' 1؎

اس قبیل کے چند شعر دیکھیے۔

رہتی ہیں آنکھیں بند تصور میں یار کے
تارِ نگہ سے اپنے بندھا ہے خیالِ دوست

1۔ تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، 2007، ص۔ 734

پردۂ غفلت اُٹھا پیشِ نظر یار ہے
دیر و حرم میں نہ جا ڈھونڈنے موجود کو

جسم خاکی کے تلے جسم مثالی بھی ہے
اک قبا اور بھی ہم زیرِ قبا رکھتے ہیں

شاعری کے اعتبار سے آتش کی شاعری میں لذّت' برمحل استعمال کی قوت' اور خیال آرائی کی نسبت ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے'' تاریخ ادب اردو'' میں ناسخ کے مقابلے میں آتش کے شاعرانہ محاسن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اوران کے بارے میں اپنے خیالات کو یوں پیش کیا ہے۔

'' کلام میں ان کے تخلص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے' تصنع اور تکلف مطلق نہیں۔ نہ معمولی اور مبتذل خیالات ہیں جن کا عیب شکوہ الفاظ سے چھپایا گیا ہو۔ نہ بیجا فضول تمثیلوں سے شعر بے مزہ کیے گئے ہیں۔ ترشے ہوئے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر اشعار میں روانی' موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ محاورات ایسے برمحل استعمال کیے گئے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے' یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں تیز انعکاس اور میر کی طرح درد وتڑپ نہیں ہے۔ پھر بھی ان کے بعض اشعار پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں۔

حق یہ ہے کہ بندش کی چستی' الفاظ کی حلاوت اور مضمون کی بلندی میں آتش کو ناسخ پر یقیناً فوقیت حاصل ہے۔ آتش کے یہاں الفاظ نہایت شریں اور مزے دار ہوتے ہیں۔ بخلاف ناسخ کے کہ ان کو موٹے موٹے الفاظ کا شوق ہے۔ آتش کے اکثر اشعار نیچرل ہوتے ہیں۔ ان میں بے تکلفی اور تڑپ ناسخ کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ آتش کے

خیالات بہت رفیع ہیں اور ان کا کیریکٹر آزادانہ اور فقیرانہ ہے جس کی ناسخ کے یہاں کمی ہے۔صوفیانہ مضامین بہ نسبت ناسخ کے آتش کے یہاں بہت زیادہ ہیں۔مختصر یہ کہ ناسخ کے کلام میں صرف شکوہ الفاظ و استعارات اور تشبیہیں ہیں اور جو مزہ و حلاوت آتش کے یہاں ہے اس میں مطلق نہیں۔زبان کی صحت و صفائی دونوں کے یہاں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتش کو ناسخ پر ترجیح ہے۔'' 1

اس میں کوئی شک نہیں کہ آتش نے اردو غزل کی داخلی اور خارجی روایت کے درمیان ایک ربط و توازن قائم کیا ہے۔اردو غزل میں ان کی خوبیاں تمام و کمال صحیح، لیکن انھیں میر و غالب کا ہم پلہ قرار دینا دیانت داری نہیں۔اگر ناقد رام بابو سکسینہ کے بیان کے مطابق آتش کو میر و غالب کی صف میں کھڑا کریں گے تو پھر میر درد، اثر لکھنوی، میر حسن اور استاد مصحفی کا درجہ کیا ہوگا؟

امداد امام اثر نے بھی رام بابو سکسینہ کی طرح آتش کے کلام پر اپنی تنقیدی آرا پیش کرتے ہوئے انھیں غالب کا مد مقابل ٹھہرایا ہے۔اور آتش و غالب کی ایک ہم طرح غزل ''نسیاں ہوگیں، عریاں ہوگئیں'' کو سامنے رکھ کر دونوں کا تقابل کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے۔

''جناب آتش مرزا اسد اللہ غالب سے قابلیتِ شاعری میں کبھی کم نہ تھے۔مگر خارجی پہلو اختیار کرنے سے خواجہ صاحب کی غزل حسبِ مراد تاثیر نہیں پیدا کر سکی۔خیالِ راقم خواجہ کی نسبت یہ ہے کہ اگر وہ دہلی وطن ہوتے تو تقاضائے ملکی سے ان کی غزل سرائی بھی قرینہ غالب زیادہ داخلی رنگ کی ہوتی۔پس ایسی صورت میں وہ یا درد و میر کے جواب ہوتے یا مومن و غالب کے ہمسر یا ان دونوں سے بھی بہتر غزل سرا نکلتے۔خواجہ کی فطری صلاحیت بڑے اعلیٰ درجے کی معلوم ہوتی ہے۔مگر چونکہ شیخ ناسخ اپنا رنگ جما چکے تھے خواجہ کو تقاضائے زمانہ سے

1۔بحوالہ مقدمۂ کلامِ آتش، خلیل الرحمٰن اعظمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2008، ص۔25۔24

بہت کچھ ملکی رنگ اختیار کرنا پڑا۔ ہزار افسوس کہ خواجہ کو داخلی پہلو کے اختیار کرنے کا موقع نہ ملا ورنہ غزل سرائی کا مرتبہ بہت اعلیٰ ہو جاتا۔ بہر کیف اس خارجی رنگ کے ساتھ بھی خواجہ صاحب کے کلام میں بھی ایسی بات ہے کہ شیخ ناسخ کو باوجود بڑی طباعی اور خلاقی سخن کے حاصل نہیں ہے۔ شیخ صاحب کے اکثر اشعار تشبیہہ اور مبالغہ سے مملو ہیں اور اکثر اشعار کی ترکیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے مصرع میں دعویٰ ہوتا ہے اور دوسرے میں دلیل۔ خواجہ صاحب بھی ملکی مذاق کے تقاضے سے بیشتر اسی رنگ کے اشعار فرما گئے ہیں۔ مگر طبیعت کی رنگینی' شوخی اور برجستگی سے ان کے اشعار میں شیخ کے اشعار کے اعتبار سے کچھ غزلیت کا ایسا انداز پیدا ہو جاتا ہے جس سے دل کو فی الجملہ غزل سرائی کی لذت نصیب ہو جاتی ہے۔ لیکن شیخ کے رنگ سے علاحدہ ہو کر جب حضرت خواجہ لطف طبیعت دکھاتے ہیں تو ان کی غزل سرائی احاطۂ تعریف سے باہر ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ واقعی خواجہ صاحب جب داخلی رنگ اختیار کرتے ہیں تو غضب کی طبیعت داری دکھا جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ غزل ایسی ہے کہ اغراض غزل سرائی کو پورا کرتی ہے۔ سبحان اللہ کیا کہنا ہے! ایک غزل ہزار دیوان کا جواب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس غزل کے اشعار ارفع درجہ کے وارداتِ قلبی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلا شبہ خواجہ کا اصل رنگ یہی ہے اور اسی رنگ کی بدولت خواجہ کی شہرت تمام ان دیار میں ہے جہاں اردو بولی جاتی ہے۔''[1]

اچھی شاعری کی تعریف میں کہا گیا ہے لفظ جسم ہے اور مضمون روح۔ اس لیے دونوں کے ارتباط کو شاعری میں ضروری سمجھا گیا ہے اس ارتباط کی تلاش میں جب آتش کی شاعری کا رخ کرتے ہیں تو ان کے یہاں مناسب الفاظ اور زبان کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ اپنے معاصر

1۔ آتش: عہد اور شاعری، ڈاکٹر محمد حیات الدین، کتابی دنیا دہلی، 2013، ص۔288

شعرا کے مقابلے میں ان کی زبان عام فہم اور موثر ہے اور پیرائے اظہار کے پردے میں ایک لطیف کیفیت پائی جاتی ہے کیونکہ وہ انتخابِ الفاظ اور ترتیبِ الفاظ وتراکیب کے لیے دہلی اور لکھنؤ کے لسانی حصار کے پابند نہیں تھے چنانچہ آتش کی زبان اور طرزِ ادا کے بارے میں ڈاکٹر حیات الدین کا خیال یہ ہے۔

''آتش زبان کی لطافت اور محاورے کی دلکشی سے اچھی طرح نہ صرف واقف تھے بلکہ اس سلسلے میں ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ کیونکہ آتش کی طبیعت و سرشت میں رندانہ پن اور بانکپن کے ساتھ ساتھ وارفتہ مزاجی اور سرخوشی کا بھی اثر تھا اس لیے انھوں نے کبھی بھی شاعری کے لیے زبان کے سخت گیر اصول اور قواعد کے حصار کو پوری طرح قبول نہیں کیا۔'' 1؎

آتش نے اپنی غزلوں میں زبان و بیان کے معاملے میں کچھ اصلاحی قدم بھی اٹھائے ہیں جسے آتش کے معترضین نے ان کے کلام کا عیب بتایا ہے اور آتش کے اسی رویّے کو شیخ ممتاز حسین نے غیر مستند ثابت کرتے ہوئے ناسخ کے مقابلے میں آتش کو پست گردانا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''لکھنؤ کے تمام شعرا ناسخ کو مستند سمجھتے ہیں اور آتش کو مستند نہیں خیال کرتے۔ آتش کا طرز مرغوب ہے لیکن اسے محققِ فن کا درجہ کبھی حاصل نہیں ہوا۔ جو شخص غلط العوام سے زیادہ مستفید ہوتا ہے وہ محقق و مستند شاعر نہیں ہوسکتا۔'' 2؎

کیفی چڑیا کوٹی کی نظر میں آتش کی زبان قابلِ تعریف ہے اور وہ یوں کہتے ہیں کہ آتش نے زبان کو زرِ خالص اور شاعری کو آئینہ بنادیا ہے۔'' آل احمد سرور کو آتش ہر اعتبار سے گوارہ ہیں لیکن انھیں آتش کی ''مرصع سازی'' اچھی نہیں لگتی' نیاز فتح پوری کو آتش نے متاثر کیا لیکن جب انھوں نے ان کے اشعار کا انتخاب کیا تو ان کی نظر آتش کے صرف گیارہ اشعار پر پڑی۔ انھوں

1۔ آتش: عہد اور شاعری، ڈاکٹر محمد حیات الدین، کتابی دنیا دہلی، 2013، ص۔296

2۔ آتش: عہد اور شاعری' ڈاکٹر محمد حیات الدین' کتابی دنیا دہلی' 2013' ص۔297

نے ان کا انتخاب کرتے ہوئے یہ نوٹ لکھا کہ ''لکھنؤ کا مشہور شاعر جس نے زندگی میں صرف گیارہ شعر کہے۔'' لہٰذا یہ ہر انسان کی اپنی ذاتی پسند و ناپسند کا معاملہ ہوتا ہے اور ہر شخص کے پسندیدگی کے زاویے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میر تقی میر کے پورے کلام سے صرف بہتر (72) اشعار کا انتخاب کر کے ان کی شاعری کو بہتّر نشتر کے نام سے کیوں موسوم کیا جاتا۔ اگر آتش کے ساڑھے آٹھ ہزار اشعار میں سے نیاز فتح پوری کو صرف گیارہ شعر ہی پسند آئے تو یہ ان کی نظر کا انتخاب ہے۔ جب کہ ''مرصع کاری'' کے الزام کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ خواجہ آتش کے کلام کی پسندیدگی کا جواز یوں فراہم کرتے ہیں۔

> ''شاعری کو محض طرزِ ادا کہہ کر ٹال دینا ادبی سہل نگاری اور آتش کی شاعری کو صرف طرزِ ادا کی گل کاری تک محدود کر دینا خود ان کے اپنے تصوّرِ شاعری کے مطابق بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وہ شاعری (خصوصاً اپنی شاعری) کو اس سے الگ بھی بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ مثلاً۔ ان کے نزدیک شاعری صرف صفائی اور سادگی سے بات کہنا ہی نہیں بلکہ ایک تخلیق اور مصوری بھی ہے جس کے بغیر شاعری اپنی وسعتوں سے محروم ہو کر محض عام بات ہو کر رہ جاتی ہے۔
>
> یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصوّر پیشہ ہیں کوئی
> نئے نقشے نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں [1]

سید عبداللہ نے مصوری کے ساتھ آتش کے کلام میں معنیٔ تہ دار کو بھی سراہا ہے اور معنی کی تہہ داری کو غزل کا حسن قرار دیا ہے۔ ناسخ سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے ''لکھنؤ کی شاعری کا اصل نمائندہ آتش کو قرار دیا ہے۔ ان کی شاعری کو لکھنؤ کی ترقی یافتہ شکل تسلیم کیا ہے۔ ناسخ کے مقابلے میں آتش کو حقیقی شاعر تصوّر کرتے ہوئے ابواللیث صدیقی بھی آتش کے رنگِ جداگانہ پر یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

> ''لکھنؤ شاعری کے عام رنگ کو انھوں نے آنکھ بند کر کے

1۔ بحوالہ مقدمۂ کلامِ آتش، خلیل الرحمٰن اعظمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2008، ص۔28

قبول نہیں کیا ہے۔یعنی ان کے یہاں خارجی مضامین اور متعلقاتِ حسن کا ذکر اگر موجود بھی ہے تو اعتدال کی حد تک ہے ۔ جذبات نگاری جس کی مثالیں عام طور پر لکھنوی شعرا کے کلام میں مفقود ہیں ۔آتش کا خاص رنگ ہے ۔خیال بندی اور مضمون آفرینی کو وہ ناپسند کرتے ہیں ۔اس کی جگہ اس عہد کے پر تکلف رنگ کے علی الرغم سادگی اور سلاست کی طرف مائل ہیں ۔اس سے ایک بات اور واضح ہوجاتی ہے یعنی اگر چہ شیخ ناسخ کی بدولت لکھنوی شاعری کا ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا تھا اور لکھنوی حضرات عام طور پر اس کی داد دیتے تھے لیکن اسی زمانے میں ایک رنگ ایسا بھی نظر آتا ہے جو اس کی ضد ہے اور لوگ اسے بھی پسند کرتے تھے ۔اور داد دیتے تھے ۔۔۔۔۔۔۔ یہ بات بھی یک گونہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ میں ہر زمانے اور ہر دور میں ایسے دو شاعر ایک دوسرے کے حریف نظر آتے ہیں جن میں سے ایک فطرت سے قریب اور دوسرا شان وشوکت' تکلف اور صناعی سے نزدیک تر ہوتا ہے ۔میر وسودا' مصحفی وانشا' آتش و ناسخ' انیس و دبیر اور داغ وامیر کی مثالیں اس کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہیں ۔[1]

بیسویں صدی کے شعرا میں یگانہ چنگیزی اور فراق گورکھپوری ایسے شاعر ہیں جنھوں نے رنگِ آتش کو پسند کرتے ہوئے ان کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کیا ہے ۔ان شعرا میں یگانہ کا لب ولہجہ' مزاج کی سرکشی اور بانکپن' کردار کا کس بل آتش کی یاد تازہ کرتا ہے ۔یگانہ کے بیشتر اشعار ان سے پہلو مارتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔آتش کے یہاں زندگی کی حرارت' انسانی تصویر کشی اور قوت وتوانائی کو پسند کرتے ہوئے انھیں ''زندگی کا شاعر تصور کرتے ہیں ۔'' آتش نے اشاروں میں زندگی پر کس طرح رائے زنی کی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

''یہ گل وبلبل والی شاعری نہیں ہے جس کے لیے لکھنؤ خواہ

1۔ بحوالہ مقدمۂ کلامِ آتش' خلیل الرحمن اعظمی' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' نئی دہلی 2008' ص۔35

مخواہ بدنام کیا جاتا ہے۔ شاعر گل و بلبل، شمع و پروانہ وغیرہ کے استعارے میں حیاتِ انسانی کا مرقع کھینچتا ہے۔ استعارہ سے لغوی معنی لینا معترض کی کج فہمی ہے۔''1؎

فراق گورکھپوری اردو غزل کے شاعر بھی ہیں اور پارکھ بھی۔ وہ غزل کی نزاکتوں سے خوب واقف تھے۔ دراصل شاعری ان کا میدان ہے اس لیے اس کے رموز وعلائم سے دلچسپی اور واقفیت ہونا ایک فطری عمل ہے۔ آتش کی شاعری پر انھوں نے الگ سے تو کوئی مضمون نہیں لکھا لیکن دیگر مضامین کے سرسری بیانات سے آتش کی شاعری کے بارے میں ان کی جو ناقدانہ رائے سامنے آئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے آتش کی غزلوں کا بغور مطالعہ کیا ہوگا اور اس کے بعد ہی اشعار کی روشنی میں اپنی بات کو مدلّل بناتے ہوئے آتش پر رائے زنی کی ہوگی۔

''آتش کے یہاں دو طرح کے اشعار ہیں۔ ایک وہ جن میں آتش کی انفرادیت گرما گرمی اور کڑک ہے۔ دوسرے وہ جن میں آتش نے مصحفی ہی کے رنگ کو چمکایا ہے اور جن کے لہجے اور انداز میں مصحفی ہی کا اعتدال اور مصحفی ہی کی نرمی پائی جاتی ہے۔''2؎

اس کے بعد استاد، شاگرد کے اشعار مثال میں پیش کیے ہیں۔ آتش کی زبان کی لطافت اور نکھار سے بحث کرتے ہوئے انھیں مصحفی کی روایت کا امانت دار قرار دیا ہے۔ حسرت موہانی والے مضمون میں آتش کے مزاج کی نشاط انگیز فضا کا اعتراف کرتے ہوئے چند اشعار اس دلیل میں پیش کیے ہیں۔ ذوق سے متعلق مضمون میں جب ابراہیم ذوق کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے اور ان کے مطلعوں کی تعریف، قافیہ پیمائی، طرزِ سخن کا انداز اور شاعری میں ڈرامائی کیفیت کی بات کرتے ہیں تب بھی انھیں آتش کی غزلوں کے مطلعے یاد آتے ہیں اور وہ ذوق کے سامنے آتش کی مطلع نگاری کے بارے میں یہ کہتے ہیں۔

''لیکن جب آتش اپنا معرکہ آرا مطلع کہتا ہے تو ذوق کا انداز

1۔ مقدمۂ کلامِ آتش، خلیل الرحمن اعظمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2008، ص۔ 33

2۔ مقدمۂ کلامِ آتش، خلیل الرحمن اعظمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2008، ص۔ 34

دھواں بن کر اُڑ جاتا ہے۔'' [1]

اور پھر موازناتی نقطۂ نظر سے دونوں کے مطلعوں کو نقل کرتے ہیں۔

مگر اس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے
(آتش)

کچھ نہیں چاہیے تجہیز کے اسباب مجھے
عشق نے کشتہ کیا صورتِ سیماب مجھے
(ذوق)

فراق نے جو فیصلہ خواجہ آتش کی شاعری کے بارے میں کیا ہے اس سے ان کے نقاد ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے آتش کو ہر زاویہ سے پرکھا اور جانچا ہے۔ آتش کے کلام پر ''تنقید و تبصرہ'' کے اس باب میں ان کے شعری محاسن اور معائب پر ناقدین اور معترضین کی جو آرا سامنے آئی ہیں وہ آتش کی شاعرانہ خصوصیات کا بر ملا اظہار، خارجیت اور داخلیت کے معاملات، تہذیب وتمدن کے معیار، اخلاق وتصوف کے آداب اور حسن وعشق کے پاکیزہ اوصاف سے متعارف کرانے کا ایک ذریعہ ہیں۔ آتش کی شاعری میں ان کی افتادِ طبع کو بڑا دخل ہے جس کے سبب شاعری کی جو شمعیں روشن ہوئیں اس کی روشنی نے آگے چلنے والوں کو راستہ دکھایا۔ حسن وعشق کے بیان میں ان کے یہاں ارضیت اور مزاج کے قلندرانہ اوصاف کا حسین امتزاج ملتا ہے اور انہی کیفیتوں میں سرشاری نظر آتی ہے، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ انھیں زندگی سے لگاؤ ہے۔ ان کا عشق مریضانہ نہیں بلکہ زندگی کی رگوں میں خون بن کر گردش کرتا ہے۔ بقول تبسّم کاشمیری ''آتش اودھ کا وہ غزل گو ہے جس کے ہاں زندگی کی رجائیت کا تصور بہت نمایاں ملتا ہے۔'' ان کے اشعار کی سہل پسندی میں لکھنوی عنصر اور بول چال کا احساس محمد حسین آزاد کو بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔ ''شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں۔'' [2]

1۔ مقدمۂ کلام آتش، خلیل الرحمن اعظمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2008، ص۔ 37

2۔ مقدمۂ کلامِ آتش، خلیل الرحمن اعظمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2008، ص۔ 16

اس کے علاوہ ان کی شاعری میں دونوں اسکولوں (دہلی، لکھنؤ) کے حسین سنگم کا احساس بھی تمام ناقدین کو ہے۔ لہٰذا یہ وہ نکات ہیں جن کا اعتراف سبھی حضرات نے کرتے ہوئے آتش کی انفرادیت کو اس طرح تسلیم کیا ہے کہ

> ''آتش کا رنگ ان کا اپنا رنگ ہوتے ہوئے بھی مختلف رنگوں کا مجموعہ تھا۔ سودا کی واہ، درد کا تصوف اور متانت، میر کی آہ، جرأت کی معاملہ بندی اور خود آتش کی رندی و سرمستی کا مجموعہ تھا۔''[1]

1۔ دبستانِ آتش، شاہ عبدالسلام، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 1977، ص۔74

انتخابِ کلام

متفرق اشعار

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش　　بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا

بہ رنگِ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں　　تو اس نے منزلِ مقصود کو زیرِ قدم پایا

آتش یہی دعا ہے خدائے کریم سے　　محتاج اے کریم نہ کیجو بخیل کا

دولتِ عشق کا گنجینۂ وہی سینہ ہے　　داغِ دل، زخم جگر مہرونشاں ہے کہ جو تھا

آدمی کیا وہ نہ سمجھے جو سخن کی قدر کو　　نُطق نے حیواں سے مشتِ خاک کو انساں کیا

مری آنکھوں کے آگے آئے گا کیا جوش میں دریا　　ہمیشہ صورتِ ساحل ہے یاں آغوش میں دریا

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے میں جا ہی ڈھونڈ تا تری محفل میں رہ گیا

آتی ہے کس طرح سے مرے قبضِ رُوح کو دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

عالم جو تھا مطیع ہمارے کلام کا کیا اسم اعظم اپنے دہن سے نکل گیا

کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

مرد درویش ہوں تکیہ ہے توکل میرا خرچ ہر روز ہے یاں آمدِ بالائی کا

اے فلک کچھ تو اثر حسنِ عمل میں ہوتا شیشہ اک رات تو قاضی کی بغل میں ہوتا

زلفیں سنبل ہیں تو پھر نرگسِ شہلا آنکھیں جس نے دیکھا ترے مکھڑے کو وہ گلشن سمجھا

رات بھر کیں دلِ بےتاب نے باتیں مجھ سے رنج و محنت کے گرفتار نے سونے نہ دیا

پیامِ مرگ سے ہوتی ہے غمگیں روح کس خاطر ملے گا خاک میں وہ جو ہوا ہے خاک سے پیدا

ہوئی ہے مردمِ دنیا کی صورت سے یہ بیزاری گماں ہوتا ہے اپنے سائے پر بھی ہم کو دشمن کا

باغِ عالم کا ہر اک گل ہے خدا کی قدرت باغباں کون ہے اس کا یہ چمن ہے کس کا

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

حُسن میں بھی عزت وذلّت خدا کے ہاتھ ہے　　گل کو پیراہن ملا تو شعلہ عریاں رہ گیا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

خراب مٹی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مردودِ دوستاں ہو　　جدا ہوا شاخ سے جو پتّا، غبارِ خاطر ہوا چمن کا

کروں میں شکر الٰہی کہاں تلک آتش　　درون صاف دیا، پاک اعتقاد کیا

خار کا کھٹکا نہیں رکھتے ہیں ہم آتش قدم　　موم ہو جاوے اگر آ جائے آہن زیرِ پا

جسے میں نیک سمجھتا تھا، مجھ سے بدظن تھا　　یقین خضر تھا جس پر مجھے وہ رہزن تھا

قتل کر کے مجھے تلوار کو توڑا اس نے　　خونِ ناحق سے پشیماں نہ ہوا تھا سو ہوا

شرط ہے رتبۂ مردانِ خدا کا انصاف　　ڈوبا فرعون وہیں موسٰی وہیں پایاب اُترا

صاف آئینے سے رخسار ہے اس دلبر کا　　یہ خدا کا ہے بنایا تو وہ اسکندر کا

تونگروں کو مبارک ہو شمع کافوری　　قدم سے یار کے روشن غریب خانہ ہوا

پھٹے کپڑے گزی کے اس سے ہم بہتر سمجھتے ہیں　　اگر اُترا ہوا ہووے تنِ نوّاب کا جوڑا

فاتحہ پڑھنے کو آئے قبر آتش پر نہ یار　　دو ہی دن میں پاسِ الفت اس قدر جاتا رہا

لگے منھ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

دو نعمتیں یہ میری ہیں میں ہوں فقیر مست
اک نانِ خشک ایک پیالہ شراب کا

چمن میں شب کو جو وہ شوخ بے نقاب آیا
یقین ہو گیا شبنم کو آفتاب آیا

معدومِ داغِ عشق کا دل سے نشاں ہوا
افسوس بے چراغ ہمارا مکاں ہوا

اے آفتابِ محشر آنکھوں سے گر گیا تو
منھ پھیرتا جدھر سے پھر میں ادھر نہ کرتا

ظہورِ آدمِ خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا

آنکھوں سے جائے اشک ٹپکنے لگا لہو
آتش جگر کو دل کی مصیبت نے خوں کیا

نہیں گفتار ہی عالم سے نرالی اس کی
طرزِ رفتار الگ، بندشِ دستار جدا

خیالِ تن پرستی چھوڑ فکرِ حق پرستی کر
نشاں رہتا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے انساں کا

ابدال سے ہوا ہے نہ اوتاد سے ہوا
اے جذبِ دل جو کچھ تری امداد سے ہوا

تری زلفوں نے بل کھایا تو ہوتا
ذرا سنبل کو لہرایا تو ہوتا

شدّاد کو خدا سے نہ کرنی تھی ہمسری
دوزخ میں گھر بہشت کی تعمیر سے ہوا

مسافر ہی نظر آیا، نظر آیا جو دنیا میں — جسے دیکھا اسے آلودۂ گردِ سفر دیکھا

مغرور ہو نہ حسنِ جوانی پہ آدمی — پیری نے آسماں کی کمر کو جھکا دیا

اس قدر اہلِ جہاں کو ہے محبت زر سے — پیٹ میں مارتے سونے کا جو خنجر ہوتا

قطع ہو جائے اگر سلسلۂ مہر و وفا — پھر گرفتار نہیں ہے کوئی، آزاد ہیں سب

گو یا زبان شمع جو ہوتی تو پوچھتا — کٹتی ہے ہجرِ یار میں کیونکر تمام رات

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر بنے — دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست

دو گھڑی بیٹھیے تکلیف جو کی ہے صاحب — بعد مدت کے تم آئے ہو ادھر آج کی رات

غافلو منزلِ دنیا ہے سرائے فانی — اس خطرگاہ میں تم چھاؤنی چھاتے ہو عبث

منہ دیکھتا ہوں یار کا کچھ کہہ نہیں سکتا — آنکھیں تو کھلی ہیں مری لیکن ہے زباں بند

مثلِ نسیم ہوں چمنِ روزگار میں — گل سے بناؤ ہے نہ مجھے خار سے بگاڑ

جلا میں شمع کے مانند عمر بھر خاموش — تمام عمر کٹی قصّہ مختصر خاموش

عشق میں صبر کار مشکل ہے — دل کے خوں کرنے کو جگر ہے شرط

عالم میں جلوہ گر ہے مرا یار اس طرح
ہوتا ہے جیسے روشنیِ انجمن چراغ

یہ دل ہے جب سے تمھارے خیال سے واقف
کہ چار خلط نہ تھے اعتدال سے واقف

وہ لوگ کرتے ہیں تعرفِ خلدِ منبر پر
گئے نہیں جو کبھی کوئے یار کے نزدیک

لاتی ہے ہر نگہ میں نیا چشمِ یار رنگ
دکھلا رہی ہے گردشِ لیل و نہار رنگ

یاد رکھنے کی جگہ ہے یہ طلسمِ حیرت
صبح کو دیکھتے ہی بھول گئے شام کو ہم

کیا ہے کس نے طریقِ سلوک سے آگاہ
مرید کس کا ہے پیرِ مغاں نہیں معلوم

بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں
حواسِ خمسہ سے بہتر کوئی سپاہ نہیں

خندۂ گل سے صدائے نالہ آتی ہے مجھے
خونِ بلبل سے مگر سینچی گئی ہیں کیاریاں

شرابِ بےخودی ایسی پلا دی ساغرِ گل نے
رہے صیاد سے مرغِ چمن غافل گلستاں میں

خوش سلوکی کی زمین و آسماں نے میرے ساتھ
آیا تھا بے پیرہن، پہنے کفن جاتا ہوں میں

کس کو پیوندِ زمیں کرتی نہیں رفتارِ ناز
کون سا سرکش تمہاری خاکِ پا ہوتا نہیں

ہوا ہے قحط کیوں عالم میں موسیٰ و تجلّی کا
وہی پتھر نظر آتے ہیں اب تک کوہساروں میں

چمن سے بلبل و قمری کا عشق، حیرت ہے ثبات گل کو نہیں سَرو کو قیام نہیں

جنس گراں بہا کا خریدار کون ہے بِکتا نہیں الٰہی تو چوری ہی جاؤں میں

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایا بالا بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگوں

بلا اپنے لیے دانستہ ناداں مول لیتے ہیں عبث جی بیچ کے الفت کو انساں مول لیتے ہیں

چاہتا ہوں جو وفا، طینتِ دلبر میں نہیں ہے وہ مطلوب مجھے جو کہ مقدر میں نہیں

برابر جان کے رکھا ہے اس کو مرتے مرتے تک ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسوں

شریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

صاف اس قدر ہے چہرہ ترا دیکھ کر جسے رنج و ملال خاطر انساں سے دور ہوں

مطلب کو میرے یار نہ سمجھے تو کیا عجب سب جانتے ہیں ترک کی ہندی زباں نہیں

نہ تو دشمن کوئی میرا نہ کوئی میرا دوست بارِ خاطر نہ کسو کا نہ غبارِ دامن

جانِ عزیز کرتے ہیں تم پر نثار ہم دل کس شمار میں ہے جگر کس حساب میں

فقر کے کوچے میں قدرِ دولتِ دنیا نہیں ٹھوکریں کھاتے ہیں یاں پارس سے پتھر سیکڑوں

تیری خوش چشمی کا افسانہ سناتا ہوں میں　　خوابِ خرگوش سے آہو کو جگاتا ہوں میں

رنج یاں جن کو ہے آتش انھیں واں راحت ہے　　اے خوشا حال جو دنیا سے خفا جاتے ہیں

تیرا نیاز مند جو اے نازنیں نہیں　　دونوں جہاں میں اس کا ٹھکانہ کہیں نہیں

رہتے ہیں ہم روز و شب کوچۂ دلدار میں　　عمر بسر ہوتی ہے سایۂ دیوار میں

اہلِ جہاں کا حال ہے کیا ہم سے، کیا کہیں　　بدگوئیاں ہیں پیچھے تو منھ پر اشارتیں

مردے کو زندہ کرتے، زندوں کو مارتے ہیں　　اس کو بگاڑتے ہیں اس کو سنوارتے ہیں

خمِ فلک سے بھروں وہ شراب شیشے میں　　یقیں ہو ذرّوں کو ہے آفتاب شیشے میں

جہاں چاہے بسر اوقات کرلے چار دن بلبل　　چمن میں آشیانہ ہے قفس صیّاد کے گھر میں

سامنا رہتا ہے اشکِ سرخ و رنگِ زرد کا　　آشنائی درد سے ہے غم سے یاری، ان دنوں

قید مذہب کی نہیں حسن پرستوں کے لیے　　کافرِ عشق ہوں میں کوئی مرا کیش نہیں

وہ شاہِ حسن ہے تو گیسوئے عنبر فشاں تیرے　　ہما کو اپنے سائے سے سعادت مند کرتے ہیں

گرفتاروں نے تیرے لطف اسیری میں اٹھایا ہے　　چلی منقار قینچی کی طرح تو پر کترتے ہیں

برنگِ آئینہ یاں رہ نہیں عشقِ مجازی کو
صفائے قلب نے حاصل کیا ہے پاک بازی کو

پھر گیا ہے اس قدر رنگِ زمانہ' چاہیے
آئینے میں بھی نہ صورت آشنا معلوم ہو

خواب بیداری پہ مرگ وزیست ہے اے بےخبر
لوحِ دل پر سے مٹا نقشِ امید وبیم کو

اے اجل جسم سے چھوٹ بھی چکے جانِ شیریں
زندگی تلخ ہوئی ہے مرے غم خواروں کو

کس توقع پر بھلا اس میکدے میں ہم رہیں
لب نہ تر ہوویں اگر سارا سمندر خشک ہو

ترے سوا کوئی ترکیب دل پسند نہ ہو
جو برقِ طور بھی چمکے تو آنکھ بند نہ ہو

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

تمنا دولتِ دنیا کی اے آتش نہیں رہتی
قناعت سے غنی اللہ کر دیتا ہے مسکیں کو

دلِ بے تاب کو فریادوفغاں کرنے دو
پہلے غمّازی کو قصّہ بیاں کرنے دو

خواب میں بھی دیکھنے سے یار کے رکھتا ہے باز
فتنۂ بیدار کہیے دیدۂ بیدار کو

شب وروز اس کو رقصِ شادمانی میں مَیں پاتا ہوں
حصارِ عافیت گرداب نے سمجھا ہے دریا کو

وقتِ آخر عشقِ پنہاں یار پر ظاہر ہوا
نزع میں عیسیٰ نے پہچانا مرے آزار کو

حسن کا شہرہ ہو ہم کو خاک میں ملوائے عشق — کارِ مردانہ کرے کوئی کسی کا نام ہو

جوہر پاک سے پاکیزہ گہر پیدا ہو — صلب یعقوب سے یوسف سا پسر پیدا ہو

بھاگ کر عاشقِ شیدا سے کہاں جاؤ گے — قدم آہستہ رکھو ٹھوکریں کھاتے نہ چلو

محبت سے بنا لیتی ہے اپنا دوست دشمن کو — جھکاتی ہے ہماری عاجزی سرکش کی گردن کو

مستِ شرابِ عشق کب آتے ہیں ہوش میں — یہ نشہ وہ نہیں ہے کہ جس کو خمار ہو

کریں گے جمع معنی فہم اجزائے پریشاں کو — شکنجے میں بہت کھینچیں گے صحاف اپنے دیواں کو

بازیچۂ ہستی میں وہ مجنونِ پری ہوں — اطفال سمجھتے ہیں کھلونا مرے دل کو

زر سا محبوب ستم گار نہیں، اس کے لیے — بیچتے سر کو جواں مرد ہیں سردار کے ہاتھ

صحرا کو چلو چاک گریباں کرو آتش — لنگر میں نہ ہیں پاؤں نہ پتھر کے تلے ہاتھ

اس قدر دل کو نہ کرائے بتِ سفاک سیاہ — زیب دیتی نہیں اس کعبے کو پوشاک سیاہ

دیکھ کر حالِ زبوں کو میرے حیراں رہ گیا — یار کے دل سے بھی تھا ہر چند پتھر آئینہ

صوفی جو سنے نالۂ موزوں کو ہمارے — حالت ہو مغنّی کے ترنم سے زیادہ

گیسوے مشکیں رُخِ محبوب تک آنے لگے — چشمۂ خورشید میں بھی سانپ لہرانے لگے

مجھ سے ہر بات میں قرآن وہ اٹھواتا ہے — گردنِ یار میں شاید ہے حمائل بھاری

دل کہیں، جان کہیں، چشم کہیں گوش کہیں — اپنے مجموعہ' کا ہر ایک ورق برہم ہے

غمّاز اپنا ذکر نہ لاوے حضورِ دوست — گردن جھکے نہ منّتِ دشمن کے بوجھ سے

وہ درددوست ہیں جو خدا ہم کو زخم دے — سو بار ٹانکے کھایئے سو بار توڑیئے

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں — رویئے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجیے

اللہ ری روشنی مرے سینے کے داغ کی — اندھیاری رات میں نہیں حاجت چراغ کی

کسی کا یار برے وقت میں نہیں کوئی — نہ دیکھا روح کو ہوتے شریکِ تن مٹی

آبلوں سے خارِ صحرا ہی نہیں سَر کھینچتے — بید کے پتّے بھی مجنوں پر ہیں خنجر کھینچتے

خدا کی یاد جوانی میں غافلو کرلو — وگرنہ وقتِ فضیلت تمام ہوتا ہے

بے رُخِ یار مجھے جان سے بیزاری تھی — چاندنی رات نہ تھی گور کی اندھیاری تھی

دولت اللہ سے کرتے جو طلب دیوانے — نقرئی طوق تو زنجیر طلائی ہوتی

عیش ہوتا کچھ اگر غمکدۂ دنیا میں
روح قالب میں خوشی سے نہ سمائی ہوتی

منزلِ دل کی خرابی کا الم کیا کیجیے
کیسے کیسے خانۂ آباد ویراں ہو گئے

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

باغِ عالم میں ہے نافہموں کو بے برگی کا غم
سبز پتے اس چمن میں زرد صورت لے گئے

کوچۂ یار میں چلیے تو غزل خواں چلیے
بلبل مست کی صورت سے گلستاں چلیے

نہ پستی و بلندی ہے نہ ایسے بھیڑ کے رستے
عدم کی راہ سب راہوں سے ہے اے بےخبر سیدھی

نہ تو بلبل نظر آتا ہے چمن میں نہ تو گل
اک طرف برگ خزاں ڈھیر ہیں یک سو کانٹے

عالم نیرنگ ہے دنیا طبائع مختلف
تنگ ہے غنچہ تو گل مسرور پیراہن میں ہے

دیواں میں ہمارے ہے مرقع کا سا عالم
مضموں ہی زبس چاندسی تصویر سے ٹپکے

شاہدِ حسن کی بیدادگری سے ہے یقیں
پائے بت کو جو چھوئے، دستِ برہمن ٹوٹے

کسی طرح سے نہ ٹوٹا طلسمِ حسرت و یاس
درِ قبول سے ٹکرا کے ہر دعا الٹی

تنہائی ہے، غریبی ہے، صحرا ہے، خار ہے
کون آشنائے حال ہے کس کو پکارئیے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

ایک عالم ہے صنم بس کہ ترا فریادی عرصۂ حشر جلو خانۂ سلطانی ہے

دیدۂ مشتاق کو منظور تو عالم میں ہے دم ترا بھرتے ہیں جب تک دم ہمارے دم میں ہے

خدا کے واسطے اک وار اور بھی قاتل تڑپ تڑپ کے کہاں تک یہ نیم جاں کاٹے

بختِ بد نے مجھے ہر چند مٹایا آتش رہ گیا نام مرا گنبدِ گرداں کے تلے

آئینہ آپ نے دیکھا ہے تو توڑیں اس کو تم سے منھ پھیر کے ثابت نہ یہ گھر تک پہنچے

ہر لحظہ دگرگوں ہے مرا حالِ پریشاں صورت نہیں ملتی مری تصویر میں میری

ہر شب شبِ برات ہے ہر روز روزِ عید سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کے

رخصتِ یار کا جس وقت خیال آتا ہے عمرِ رفتہ کو مجھے یاد دلا جاتا ہے

دامانِ دوست کی ہے سکندر کو آرزو باہر کفن سے ہاتھ نہیں بے سبب رہے

میرے مرنے کی خبر ہو نہ کسی کو معلوم دوست گریاں نہ تو دشمن کوئی خنداں ہووے

دیوانہ اک پری کی ہے رکھتی ہوا مجھے زنداں سے تنگ تر ہے یہ وحشت سرا مجھے

وبالِ جاں ہوا ہے جسمِ خاکی ضعفِ پیری سے
قفس سے تنگ بلبل کو خزاں میں آشیانہ ہے

خوب روئے حال پر اپنے وطن کا سُن کے حال
کوئی غربت میں جو آ نکلا ہمارے شہر سے

گلزارِ جہاں پر نہ پڑی آنکھ ہماری
کوتاہ تھی عمر اپنی حبابِ لبِ جو سے

دل گزرگاہِ حسیناں تھا تصوّر سے کبھی
یاد اس ویرانے کی آتی ہے آبادی مجھے

کرتے ہیں عبث یار ملامت مجھے آتش
مجبور ہے یہ خاک کا پتلا شدنی سے

کوئی ویرانہ آتش کوئی آبادی نہیں باقی
تلاشِ گوہرِ مقصود میں کیا خاک چھانی ہے

برقِ رفتار ہوں منزل ہے مری زیرِ قدم
ابر گھیرے مجھے ہر چند کہ باراں روکے

آتش خدا کے واسطے موقوف فکرِ شعر
طاقت نہیں دماغ کو نظمِ کلام کی

مثلِ شبنم ہوں صاف دل قانع
مجھ کو دریا ہے بوند پانی کی

نیازِ خادمانہ ہے وہی فضلِ الٰہی سے
بتوں کی ناز برداری جو پہلے تھی سواب بھی ہے

عارف ہے وہ جو حسن کا جویا جہاں میں ہے
باہر نہیں ہے یوسف اسی کارواں میں ہے

تا چند کرے گا رقمِ سوزِ دل آتش
رکھ ہاتھ نکلتا ہے دھواں مغزِ قلم سے

گرم جوشیِ محبت کا وہی انداز ہے | داغ دل سے ربط ہے سوز وجگر سے ساز ہے

جسم کو جانتے ہیں صنعتِ دستِ قدرت | روح کو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ امرِ رب ہے

اے صنم جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے | اسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے

خالی زمانے کو نہ سمجھ حسن وعشق سے | پروانہ اور شمع ہنوز انجمن میں ہے

بیداد کے محفل میں سزاوار ہمیں تھے | تقصیر کسی کی ہو، گنہگار ہمیں تھے

نادان نہ ہو، عقل عطا کی ہے خدا نے | یوسف کی طرح تم کو کوئی بیچ نہ ڈالے

سلسلہ اپنی گرفتاری کا کب ختم ہوا | پہنی پازیب انھوں نے جو اتارے توڑے

خدا پر رکھ نظر طالب اگر ہے دین ودنیا کا | یقیں ہے دولتِ کونین حاصل ہو توکّل سے

زیرِ زمیں بھی چین کی صورت نہیں کوئی | آسودگانِ خاک کی مٹی خراب ہے

حشر تک ہووے نہ وہ زلفِ سیہ آتش سفید | دوں جسے تشبیہہ اپنے نامۂ اعمال سے

مٹالے چار دن مجھ کو گیا جس روز جنت میں | کہاں پیری، وہی میں ہوں وہی میری جوانی ہے

وصالِ شاہدِ مقصود ہوگا بعدِ فنا | وہ دل رُبا جو ملے گا تو جاں نثاری سے

بلبلِ شیدا کے نالوں سے یہ آتی ہے صدا
فصلِ گل ہے چار دن، سیرِ گلستاں کیجیے

کس سر کو نہیں یار کی رفتار کا سودا
معراج وہ سمجھا ہے جو پامال ہوا ہے

فکرِ رنگیں ہم کو دکھلا لی ہے گھر بیٹھے بہار
مثلِ بلبل نالہ کرنے کو چمن کیا چاہیے

جاں سے عزیز دل کو رکھتا ہوں آدمی ہوں
کیونکر کہوں میں مجھ کو حسرت نہیں ہے کوئی

افسوس کیا جوانیِ رفتہ کا کیجیے
وہ کون سی بہار تھی جس کو خزاں نہ تھی

تکیے میں آدمی کو لازم کفن ہے رکھنا
بیٹھا رہے مسافر رختِ سفر سنبھالے

تماشہ گوشہ گیری دشتِ غربت دکھاتی ہے
وطن میں ہوں مگر مجھ کو ہیں یارانِ وطن بھولے

التجا تجھ سے کب اے قبلۂ حاجات نہ تھی
تیری درگاہ میں کس روز مناجات نہ تھی

طفلی کے گریہ کا یہ کھلا حال وقتِ مرگ
آغاز ہی میں روتے تھے انجام کے لیے

نقصانِ جاں بھی راہ خدا میں مفید ہے
مارا گیا جہاد میں جو وہ شہید ہے

بوئے یوسف سے ہوا تازہ دماغِ یعقوب
للہ الحمد صبا مصر سے کنعاں آئی

عفو ہو جائیں گے ہر چند کہ لاکھوں ہوں گناہ
یہ عطا ہے تری رحمت کے قریں تھوڑی سی

غم نہیں ثابت قدم کو گو جہاں گردش میں ہے
قطب کو جنبش نہیں ہے آسماں گردش میں ہے

دیدۂ یعقوب سے دیکھا جو عالم کی طرف
یوسف اس بازار میں ہر سو نظر آیا مجھے

دو ساغرِ شراب ہیں دو چشم مستِ یار
گردن مثالِ گردنِ مینا بلند ہے

سرِ فرہاد کی تیشے سے یہ آئی ہے صدا
کھائے یہ چوٹ جو پتھر تو ہو پتھر ٹکڑے

واقعہ منصور کا سن کر کھلا ہم پر یہ عال
حق کہے سے آدمی ہوتا ہے قابل دار کے

نورِ تجلّی ہے ترے رخسار کے لیے
آنکھیں مری کلیم ہیں دیدار کے لیے

جو کچھ عذاب زیرِ زمیں ہو عجب نہیں
ساتھ اپنے گور میں بھی ہمارے عمل چلے

نکہتِ گل سے مجھے یار کی بو آتی ہے
خار سے یاد اُلجھ پڑنے کی خو آتی ہے

نیرنگِ حسن و عشق کی اللہ رے بہار
بے کار کوئی فعل نہیں کارساز کا

لباسِ یار کو میں پارہ پارہ کیا کرتا
قبائے گل سے اسے استعارہ کیا کرتا

اللہ کے سوا نہ کسی نے کبھی سُنا
نالہ مرا غریب کی فریاد ہو گیا

دیوانہ ہے دل یار تری جلوہ گری کا
مشتاق نہایت ہی یہ شیشہ ہے پری کا

دکھلا کے جلوہ آنکھوں کی اک شمع نور کا
گل کر دیا چراغ ہمارے شعور کا

تھا شوق زبس منزلِ مقصود کا آتش
ملے اس کو کیا سامنے جو مرحلہ آیا

پا برہنہ، سرِ عریاں وتنِ گرد آلود
ہے کراماتِ گدا حالِ گدا سے پیدا

عالم میں مجھ کو قاتلِ خوش رو کی ہے تلاش
جلاد ڈھونڈتا ہے گنہگار دل فریب

کشتے ہیں محبت کے تری زندۂ جاوید
مردوں کو مبارک ہو تمنّائے قیامت

دل کو ہوئے ہیں معنیِ توحید منکشف
آنکھوں کو کچھ نظر نہیں آتا سوائے دوست

ہوئی ہے خانۂ دل میں جو روشنی منظور
کیا ہے آنکھوں نے اپنی چراغِ طور پسند

دکھلائے گی کیا شام غریباں کے شگوفے
ہر چند کہ غنچوں کو کرے صبحِ وطن پھول

بھروسہ زندگانی کا نہیں کچھ
کفن لے رکھے اے آتش، بشرمول

آرزو ہے تجھے سجدے سحر و شام کریں
ہمہ تن ہو کے زباں وردترا نام کریں

ہم فقیروں کو ہے دیوار کا سایہ کافی
خوش رہیں وہ جو کہ خس خانے میں آرام کریں

کوئے حبیب میں ہے چلتی ہوائے جنت
مردہ ہیں زندہ ہوتے کشتے چراغ روشن

مقصود دل ہے قلزمِ خوں میں شناوری
جس گھاٹ چاہے یار کی تلوار لے چلے

خلیل کا اسے کعبہ نہ جانیو آتش
خدا کا گھر ہے یہ، دل تک رسائی مشکل ہے

اک دن حضورِ قلب سے ہوتی نہیں ادا
زاہد تری نماز کو میرا سلام ہے

بہارِ بے خزاں ایسی نہیں کوئی چمن رکھتا
خدا جو فکرِ رنگیں دے تو یہ گلزار بہتر ہے

آئینہ لے کر کیجیے اپنا مشاہدہ
ہم سے سلوک شرم و حیا، کچھ نہ پوچھیے

زندے وہی ہیں جو کہ ہیں تم پر مرے ہوئے
باقی جو ہیں سو قبر میں مردے بھرے ہوئے

ناقوس میں سے آئی صدائے ہوالغفور
ہم بتکدے گئے جو خدا سے ڈرے ہوئے

خوشحال ہیں مٹا کے مجھے، ہفت آسماں
یوسف کو کھا کے ہو گئے ہیں شیر بھیڑیے

خامے سے کام لیجیے ہنگامِ فکرِ شعر
میدانِ کارزار میں گھوڑا اٹھائیے

تماشا گاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو
کسے اس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے

چپ ہو کیوں، کچھ منھ سے فرماؤ خدا کے واسطے
آدمی سے بت نہ بن جاؤ خدا کے واسطے

شراب ان کو پلا کر ہوئی پشیمانی
وہ بے حجاب ہوئے تو مجھے حیا آئی

مری آنکھوں کے آگے آئے گا کیا جوش میں دریا	ہمیشہ صورتِ ساحل ہے یاں آغوش میں دریا

کوچۂ یار بھی مجھ کو وہی دکھلا دے گا	کس نے بلبل کو تماشائے چمن دکھلایا

دوست دشمن نے کیے قتل کے ساماں کیا کیا	جانِ مشتاق کے پیدا ہوئے خواہاں کیا کیا

دورِ شراب حلقۂ بیرونِ در ہے یاں
آتی ہے باغ سے تو صبا سے ہوں پوچھتا

اس بزم میں ہے مست ہر اک اپنے حال میں
کتنے شگوفے آئے ہیں کس کس نہال میں

سرمہ منظور نظر ٹھہرا ہے چشم یار کو
رات بھر آنکھوں کو اس امید پر رکھتا ہوں بند

نیلگوں گنڈا پہنایا مردمِ بیمار کو
خواب میں شاید کہ دیکھوں طالعِ بیدار کو

نہ سنا تھا سو وہ کانوں نے سُنایا مجھ کو
طور پر حضرتِ موسیٰ نے تجلّی دیکھی

جو نہ دیکھا تھا ان آنکھوں نے دکھایا مجھ کو
بام پر یار نے دیدار دکھایا مجھ کو

جور و جفائے یار سے رنج و محن نہ ہو
شادی نہیں قبول مجھے غم قبول ہے

دل پر ہجوم غم ہو، جبیں پر شکن نہ ہو
میری خوشی سے تنگ میرا پیرہن نہ ہو

نسیمِ نوبہاری کی طرح آئے ہو گلشن میں
جدھر جاتے ہو ہر گھر میں سے یہ آواز آتی ہے

تماشائے گل و سرد و صنوبر دیکھتے جاؤ
مسیحا ہو جو بیماروں کو دم بھر دیکھتے جاؤ

بہارِ گل میں پیالہ لگا لیا منھ سے
فقیر کو نہیں درکار شان امیروں کی

شراب پینے کو میں استخارہ کیا کرتا
سرِ برہنہ مرا گوش وارہ کیا کرتا

خدا یاد آ گیا مجھ کو بتوں کی بے نیازی سے
رسائی مصر تک اس کی تو اس کی حشر تک حد ہے

ملا بامِ حقیقت زینۂ عشقِ مجازی سے
مہِ کنعاں کو کیا نسبت ہے خورشید حجازی سے

کوچۂ دلبر میں میں، بلبل چمن میں مست ہے
نشۂ دولت سے منعم پیرہن میں مست ہے

ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے
مردِ مفلس حالتِ رنج و محن میں مست ہے

ایک حرف اس کی عبارت کا پڑھا جاتا نہیں — لکھ دیا کس خط میں ہے یہ خطِ پیشانی مجھے
شہر خوباں میں نہیں آتش مروت کا رواج — تشنہ لب مر جاؤں تو ممکن نہ ہو پانی مجھے

دردِ دل سے کبھی نالہ جو کر اٹھتا ہوں میں — آسماں چرخ میں آتا ہے زمیں پھٹتی ہے
شبِ ہجراں کی درازی کا گلہ کیا کیجیے — خضر کی عمر بھی دو چار گھڑی گھٹتی ہے

کوچۂ یار کے نظارے میں اغیار الجھے — سیرِ گلزار میں دامن سے مرے خار الجھے
کفر و اسلام سے آزاد ہوں بے قید ہوں میں — مجھ سے کافر ہی نہ جھگڑے نہ تو دیندار الجھے

حسنِ یوسف ہے وہی رونقِ بازار اب تک — وہی کثرت ہے جو کثرت کہ خریدار میں تھی
طور پر کیجو آتش کو عزیزو تم دفن — آرزو اس کو بہت جلوۂ دیدار کی تھی

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ — قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے
الٰہی ایک دل کس کس کو دوں میں — ہزاروں بت ہیں یاں ہندوستاں ہے

سائل نجات کا ہوں خدائے کریم سے — رحمت بزرگ تر ہے گناہِ عظیم سے
اللہ سے بھی ان کو زیادہ غرور ہے — دو باتیں کیں نہ ایک صنم نے کلیم سے

حیواں پر آدمی کو شرف نطق سے ہوا — شکرِ خدا کرے جو زبانِ بشر کھلے
پاپوش ہم نے ماری ہے دستار و تاج پر — سودائے زلف یار میں رہتے ہیں سر کھلے

گلزار ترا تجھ کو مبارک رہے بلبل — بلبل ترے گلزار سے کیا کام ہے ہم کو
اللہ ہے مشکل میں مددگار ہمارا — اعوان سے انصار سے کیا کام ہے ہم کو

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا — بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا — مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

مفلس کا کام یاں نہیں دولت کا کھیل ہے — دنیا خمار خانہ ہے چلتی ہے زر کی چوٹ
بدتر نہیں ہے غم غمِ فرزند سے کوئی — دل کو نصیب ہو نہ الٰہی جگر کی چوٹ

کیا حال ہے کسی نے پوچھا ہزار حیف — نالاں رہے جرس کی طرح کارواں میں ہم
آیا ہے یار فاتحہ پڑھنے کو قبر پر — بیدار بخت خفتہ ہے خواب گراں میں ہم

گستاخ ہاتھ گردنِ دلبر میں خم ہوا — حدِ ادب سے شوق کا باہر قدم ہوا
یاد آیا طوافِ کعبہ میں ہندوستاں مجھے — کوئے بتاں کا سایہ لباسِ حرم ہوا

ہے سزاوار اہلِ دولت سے فقیروں کا غرور — ہاتھ کو جو کھینچ لے گا پاؤں کو پھیلائے گا
یہ صدا آتی ہے شورِ بحرِ ہستی سے مجھے — گوہرِ مقصود اس دریا سے باہر پائے گا

عشق پیدا کر کسی مستانہ آنکھوں کا دلا — خانۂ تاریک میں روشن چراغِ بادہ ہو
عشق ہونے میں نہیں ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز — خوبصورت ہو، گدا زادہ ہو یا شہزادہ ہو

نوجوانی کی ہے پیری میں تمنا باقی — موسم گل کے گئے پر بھی ہے سودا باقی
دیکھ لیں، ہے جو قیامت کا تماشہ باقی — ہو چکے وہ بھی جو ہے صحبتِ فردا باقی

☆☆☆☆☆☆☆

دل کی کدورتیں اگر انساں سے دور ہوں — سارے نفاق گبرو مسلماں سے دُور ہوں
فصلِ بہار آئی ہے کپڑوں کو پھاڑیئے — دل کے نجار دست وگریباں سے دُور ہوں
ممکن نہیں نجات اسیرانِ عشق کو — یہ قیدی وہ نہیں کہ جو زنداں سے دُور ہوں

ممکن نہیں ہے دوسرا تجھ سا ہزار میں — ہوتا ہے اک بہشت کا دانہ انار میں
صحرائے تن کی سیر تو مجنوں ذرا کرے — محمل سوار ہے اسی گرد وغبار میں
جامِ شرابِ عشق سے دونوں ہیں بےخبر — بلبل چمن میں مست ہے ہم کوئے یار میں

قلزمِ عشق میں تنکے کا سہارا بھی نہ ڈھونڈھ — آسرا وہ نہیں لیتے جو خدا رکھتے ہیں
جسمِ خاکی کے تلے جسم مثالی بھی ہے — اک قبا اور بھی ہم زیرِ قبا رکھتے ہیں
اپنے ہر شعر میں ہے معنیِ تہ دار آتش — وہ سمجھتے ہیں جو کچھ فہم و ذکا رکھتے ہیں

طولِ شبِ فراق کا قصّہ بیاں نہ ہو — خط یار کو لکھوں تو سیاہی رواں نہ ہو
صورت کوئی صفائی کی اب اے صنم نہیں — جب تک ہمارے تیرے خدا درمیاں نہ ہو
اے آسماں نمود نہیں ہم کو چاہیے — بعدِ فنا مزار کا اپنے نشاں نہ ہو

پیچھے ہٹا نہ کوچۂ قاتل سے اپنا پاؤں — سر سے تڑپ کے چار قدم آگے دھڑ گیا
درماں سے اور درد ہمارا ہوا دوچند — مرہم سے داغِ سینہ میں ناسور پڑ گیا
آتش نہ پوچھ حال تو مجھ دردمند کا — سینے میں داغ، داغ میں ناسور پڑ گیا

جب کہ رسوا ہوئے، انکار ہے پھر بات میں کیا — اے صنم لطف ہے پردے کی ملاقات میں کیا
یار نے وعدۂ فردائے قیامت تو کیا — شک ہے اے نالۂ دل تیری کرامات میں کیا
کوئی بت خانے کو جاتا ہے کوئی کعبہ کو — پھر رہے گبرو مسلماں ہیں تیری گھات میں کیا

فرطِ شوق اس بت کے کوچے میں لگا لے جائیگا کعبۂ مقصود تک مجھ کو خدا لے جائیگا
کاٹ کر پر بھی مجھے صیاد بے قابو نہ چھوڑ ناتواں ہوں باد کا جھونکا اڑا لے جائیگا
مصر تک پہنچے نہ جو کنعاں سے وہ یوسف ہوں میں دست اخواں سے چھٹا تو بھیڑیا لے جائیگا

زنّارِ عشق بُت میں رگِ جاں ہے ان دنوں ناقوس برہمن دلِ ناتواں ہے ان دنوں
کافر ہوا ے صنم جو خرید ے نہ تو اسے مہندی کے مول خونِ مسلماں ہے ان دنوں
قد سروٗ چہرہ گل ہے تو سنبل ہے روئے یار گھر خانہ باغ ہے جو وہ مہماں ہے ان دنوں

اس مشقت سے اسے خاک نہ ہوگا حاصل جاں عبث جسم کی بیگار لیے پھرتی ہے
تو نکلتا نہیں شمشیر بکف اے قاتل موت میرے لیے تلوار لیے پھرتی ہے
مالِ مفلس مجھے سمجھا ہے جنوں نے شاید وحشتِ دل سرِ بازار لیے پھرتی ہے

عذاب گور سے واعظ نہایت ہی تو جو ڈرتا ہے ہمارے ساتھ پیوند زمیں کیا آسماں ہوگا
ہوائے دہر اگر انصاف پر آئی تو سن لینا گل و بلبل چمن میں ہوں گے باہر باغباں ہوگا
نہیں اسرار سے آتش یہ پتلا خاک کا خالی یہی وہ گرد ہے جس سے سوار آخر عیاں ہوگا

خدا بخشے، صنم مجھ کو یہ کہہ کے مجھ کو یاد کرتے ہیں
دعائیں مغفرت میرے لیے جلاد کرتے ہیں
یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصوّر پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے، نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں
عجب نعمت عطا کی ہے خدا نے اہلِ غیرت کو
عجب یہ لوگ ہیں غم کھا کے دل کو شاد کرتے ہیں
کمر باندھی ہے گل چینوں نے غارت پر گلستاں کے
اجارہ بلبلوں کے خون کا صیّاد کرتے ہیں

آہستہ پاؤں رکھیے قیامت نہ کیجیے
ٹھوکر سے فتنے ہوتے ہیں بیدار دیکھیے
چن چن کے قتل کیجیے انصاف شرط ہے
حاضر ہیں بے گناہ و گنہگار دیکھیے
عالم کی سیر کیجیے آتش ملے گا یار
یوسف جو چاہیں آپ تو بازار دیکھیے
دل کو بغل میں مار کے لے تو چلے ہیں چوک
کہتی ہے کیا نگاہِ خریدار دیکھیے

وہ افسوس ہے ہماری شعر خوانی
جو سنتا، گنگ ہو جاتا فغانی
ہوا کوئی نہ حالِ دل سے آگاہ
رہی مشتاقِ گوش اپنی کہانی
خدا کے فضل سے ہے قوتِ نطق
کلام اپنا ہے ہاتف کی زبانی
مرا دیواں ہے اے آتش خزانہ
ہر اک بیت اس میں ہے گنجِ معانی

رنگ جو جو کچھ کہ چاہیں لائیں بن میں آبلے
پائے بوسی کو ترستے تھے وطن میں آبلے
چشمِ زخم خار سے یا رب بچانا تو اُسے
اک رفیقِ حال ہیں رنج و محن میں آبلے
پاؤں کے چھالے تو نذرِ خارِ صحرا کر چکے
پھوڑیے اب چل کے دل کی انجمن میں آبلے
اس قدر مجھ سے زمانے کی ہوا ہے برخلاف
کیا عجب بوئے حنا ڈالے بدن میں آبلے

کام رہنے کا نہیں بند اپنا
بندۂ پرور ہے خداوند اپنا
کیوں نہ یعقوب کو یوسف ہو عزیز
کس کو پیارا نہیں فرزند اپنا
شجرِ قدوس ہیں ہم عالم میں
اس چمن میں نہیں پیوند اپنا
دَولتِ فقر سے رکھتا ہے غنی
ہم کو آتش دلِ خرسند اپنا

ایسی وحشت نہیں دل کو کہ سنبھل جاؤں گا
صورتِ پیرہن تنگ نکل جاؤں گا
وہ نہیں ہوں میں رکھائی سے جوٹل جاؤں گا
آج جاتا تھا تو ضد سے تیری کل جاؤں گا
کوچۂ یار کا سودا ہے مرے سر کے ساتھ
پاؤں تھک تھک کے ہوں ہر چند کہ شل جاؤں گا
حالِ پیری کسے معلوم جوانی میں تھا
کیا سمجھتا تھا کہ دو دن میں بدل جاؤں گا

منزلِ گور اب مجھے اے آسماں درکار ہے
مردمِ بیمار کو نقلِ مکاں درکار ہے
ساحلِ دریائے ہستی ہے کنارا گور کا
کشتیِ تن کے لیے بھی بادباں درکار ہے
سیرِ بامِ عرش کی دکھلاتی ہے دل کی تڑپ
صاحبِ تاثیر کو کیا نردباں درکار ہے
شہر وصحرا میں پھرا کرتا ہوں اس امید پر
وہ جگہ دیکھوں مری مٹی جہاں درکار ہے

ایک دن فرصت جو میں برگشتہ قسمت مانگتا
دیدۂ تر نوحؑ کے طوفاں کی رخصت مانگتا
تیز بارانِ بلا سے ہوگئی کشت اپنی سبز
رہ گیا دہقاں دعائے ابرِ رحمت مانگتا
آ کے میری خاک پر روتے حسینانِ بہشت
میں اگر اللہ سے بارانِ رحمت مانگتا
کیا کہوں آتش اثر اپنی زباں کمبخت کا
تنگ ملتی گورِ تیرہ گر فراغت مانگتا

شبِ فراق میں اک دن نہیں قرار آیا
خدا گواہ ہے شاہد ہے آرزو تیری
مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری
یہ گردش فلکِ پیر سے ہوا ثابت
قوی ضعیف کو کرتی ہے جستجو تیری
یہ چاکِ جیب کے حق میں دُعائے مجنوں ہے
نہ ہو وہ دن کہ درستی کرے رفو تیری
زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں
رہے گی معرکے میں آتش آبرو تیری

ہر چشم کو دیدار ترا مدِّ نظر ہے
جو گوش ہے مقصود اسے تیری خبر ہے
بیکار بنائے نہیں آنکھوں کے پیالے
دیدار کا سائل ہو جو یارائے نظر ہے

قالب کی طرح روح دکھائی نہیں دیتی
پنہاں یہ مسافر ہے عیاں گردِ سفر ہے
یہ صدمے اٹھائے ہیں جدائی میں کسی کی
دو قطرۂ خوں ہیں نہ تو دل ہے نہ جگر ہے
آفت ہے کوئی ذکرِ فقیرانہ ہمارا
اک نعرۂ ہُو میں دو جہاں زیر و زبر ہے

مری آنکھوں کے آگے آئے گا کیا جوش میں دریا
ہمیشہ صورتِ ساحل ہے یاں آغوش میں دریا
خموشی اور گویائی مری اک اک سے بہتر ہے
سکونت میں یہ قطرہ ہے گُہر تو جوش میں دریا
سرک جاوے جو روے چشمِ تر سے گوشۂ دامن
نہ دیکھا ہو کسی نے ایسا اپنے ہوش میں دریا
کیا جو ضبط گریہ تو کیا دریا کو کوزے میں
کبھی دل کھول کر رویا تو آیا جوش میں دریا
اگر موتی نہ بنتے قطرہ ہاے ابر نیساں سے
تو حلقہ ڈالتا آتش صدف کے گوش میں دریا

ہے نرالی کشش عشقِ جفا کار کی راہ
چاہِ کنعاں میں ملی مصر کے بازار کی راہ
شہرۂ حسن نے دیدار کا مشتاق کیا
نکہتِ گل نے بتائی مجھے گلزار کی راہ
تنگ دستی نے زمانے میں یہ پایا ہے رواج
یوسف اس عہد میں تکتا ہے خریدار کی راہ
لبِ بام آ کے جو دیدار کرے عام وہ شوخ
ایک ہو جائے ابھی کافر و دین دار کی راہ
حسن کے عشق نے ہستی میں عدم سے کھینچا
شوقِ یوسف نے دکھائی ہمیں بازار کی راہ
غیرِ حق کو میں سمجھتا ہوں خیالِ باطل
آتش اک دل میں نہیں ہوتی ہے دو چار کی راہ

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے
ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انساں
زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے
ہالے میں ماہ کو ہوتا ہے چکوروں کو یقیں
کبھی انگڑائی جو وہ رشکِ قمر لیتا ہے
منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے
گنجِ پنہاں ہیں تصرف میں بنی آدم کے
کان سے لعل یہ، دریا سے گہر لیتا ہے
نظر آ جاتا ہے اے گل جسے رخسار تیرا
پھولوں سے دامنِ نظارہ وہ بھر لیتا ہے

غم نہیں کوئے بتاں میں جو نہیں جا خالی
باغِ فردوس میں ہے پہلوِ حورا خالی

اے صنم مہر و وفا سے نہیں دنیا خالی
کون سا دل ہے نہیں جس میں تری جا خالی

نیچی نظروں سے ہوا اس کی زمانہ پامال
آنکھ اُٹھائی تو کیا عالم بالا خالی

گردشِ چشم نہیں گردشِ افلاک سے کم
گھر کے گھر کرتی ہے وہ نرگسِ شہلا خالی

شکر کس منہ سے کروں گوشۂ تنہائی کا
مجھ کو دل کھول کے رونے کو ملی جا خالی

سمجھے آتش نہ کوئی آدمِ خاکی کو حقیر
نہیں اسرار سے یہ خاک کا پتلا خالی

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا

خاک پر سنگ دریار نے سونے نہ دیا
دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا

شام سے وصل کی شب آنکھ نہ جھپکی تا صبح
شادیٔ دولتِ دیدار نے سونے نہ دیا

ایک شب بلبل بیتاب کے جاگے نہ نصیب
پہلوئے گل میں کبھی خار نے سونے نہ دیا

رات بھر کیں دل بیتاب نے باتیں مجھ سے
رنج و محنت کے گرفتار نے سونے نہ دیا

سچ ہے غم خوارئ بیمار عذابِ جاں ہے
تا دمِ مرگ دلِ زار نے سونے نہ دیا

اس شش جہت میں خوب تری جستجو کریں
کعبے میں چل کے سجدہ تجھے چار سو کریں

عاشق جو حُسنِ پاک میں کچھ گفتگو کریں
دامن کا پیچھے نام لیں پہلے وضو کریں

دیوانگی کا سلسلہ جاوے نہ ہاتھ سے
دامن کو پھاڑیے جو گریباں رفو کریں

دیدارِ عام کیجیے پردہ اٹھائیے
تا چند بندہ ہائے خُدا آرزو کریں

لکھ دیتے ہیں حسینوں کو ہم خطِ بندگی
مشقِ ستم کو ترک جو یہ تند خو کریں

موجود گو کہ تو ہے مگر چاہتا ہے شوق
آوارہ ہوں، تلاش تری چارسو کریں

آتش یہ وہ زمیں ہے کہ جس میں بقولِ درد
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

کیا کیا نہ رنگ تیرے طلب گار لا چکے
مستوں کو جوش، صوفیوں کو حال آ چکے

پہنچے تڑپ تڑپ کے بھی جلاد تک نہ ہم
طاقت سے ہاتھ پاؤں زیادہ ہلا چکے

ہوتی ہے تن میں روح پیامِ اجل سے شاد
دن وعدۂ وصال کے نزدیک آ چکے

بے وجہ ہر دم آئنہ پیشِ نظر نہیں
سمجھے ہم آپ آنکھوں میں اپنی سما چکے

اٹھا نقاب چہرۂ زیبائے یار سے
دیوار درمیاں جو تھی ہم اس کو ڈھا چکے

مجبور کر دیا ہے محبت نے یار کی
باہر ہم اختیار سے ہیں اپنے جا چکے

صدموں نے عشقِ حسن کے دم کر دیا فنا
آتش سزا گناہِ محبت کی پا چکے

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

پیامِ بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

ہمیشہ رنگِ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے

یہ کعبہ سے نہیں بے وجہ نسبتِ رُخ یار
یہ بے سبب نہیں مردے کو قبلہ رو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے

تلاشِ یار میں کیا ڈھونڈیے کسی کا ساتھ
ہمارا سایہ ہمیں ناگوار راہ میں ہے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

کوئی تو دوش سے بارِ سفر اتارے گا
ہزار راہ زن امیدوار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں خار، راہ میں ہے

دلِ بیتاب کو فریاد و فغاں کرنے دو
پہلے غمّاز کو ہی قصّہ بیاں کرنے دو

جانبِ دشتِ عدم خیمہ رواں کرنے دو
وحشتِ دل کو علاجِ قفقاں کرنے دو

سوزِ دل میری طرح سے نہ بیاں ہوویگا
شمع کافوری کو بھی چربِ زباں کرنے دو

کوہِ غم ٹوٹنے پر آہ ہے یاں کم ظرفی
ٹھیس سے کاسۂ چینی کو فغاں کرنے دو

آخرکار تہِ خاک ہے مسکن سب کا
اہل دولت کو بلند آج مکاں کرنے دو

میں تو شاعر نہیں عاشق ہوں، مجھے کیا ہووے
کاکلِ یار پہ افعی کا گماں کرنے دو

انتظارِ ملک الموت میں بیدار ہوں میں
بختِ خفتہ کو مرے خواب گراں کرنے دو

آج تک آہ کے کوڑوں سے بدن نیلا ہے
آسماں کو مجھے رسوائے جہاں کرنے دو

اہلِ اسلام ہوں غیبت نہیں شیوہ میرا
میرے دشمن کو مرے عیب عیاں کرنے دو

پھوٹ بہنے دو انہیں یار کے آگے آتش
دل بھی احوال بھی آنکھوں کو بیاں کرنے دو

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

کیا کیا الجھتا ہے تری زلفوں کے ناز سے
بخیہ طلب ہے سینۂ صد چاکِ شانہ کیا

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

اڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کہتے ہیں گے کسے تازیانہ کیا

زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مشتِ خاک
بامِ بلند یار کا ہے آستانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے دام ودانہ کیا

طبل وعلم ہی پاس نہ اپنے، نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مرے قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

ہوتا ہے زرد سن کے جو نامرد مدّعی
رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا

ترچھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے تو اڑے گا نشانہ کیا

صیّاد گل عذار دکھاتا ہے سیرِ باغ
بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا

بیتاب ہے کمال ہمارا دلِ حزیں　　مہماں سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا
یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے　　آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

☆☆☆

واسوخت

آگے یک یار نہ تھا یار، ترے یار تھے ہم
ہمدم و ہم سخن و مونس و غم خوار تھے ہم
لطف و اشفاق و عنایت کے سزاوار تھے ہم
مدعی اب جو ہیں مجبور تھے، مختار تھے ہم
چیں جبیں پر نہ تھی رنجش کی نہ یہ باتیں تھیں

انس تھا ہم سے تمھیں ہم تھے تمہارے مائل
عشق تھا حسنِ خداداد سے ہم کو کامل
غم و اندوہِ جدائی سے نہ واقف تھا دل
باغِ عالم میں مرادیں تھیں ہماری حاصل
سرو قد قمریِ بے صبر و تحمل ہم تھے
گل تمھارا رخ گلرنگ تھا بلبل ہم تھے

گوش زد یار ترے نام نہ تھا غیروں کا
لانے پاتا کوئی پیغام نہ تھا غیروں کا
خلوت و بزم میں کچھ کام نہ تھا غیروں کا
گرد حلقہ سحر و شام نہ تھا غیروں کا
دامنِ پاک سے گرد محن آباد نہ تھی
کوچہ گردوں کو طبیعت میں تری راہ نہ تھی

دلبری اپنی تجھے رہتی تھی منظورِ رائے دوست
ایک دم آنکھوں سے ہم ہوتے نہ تھے دورائے دوست
دشمن اس طرح سے پھرتے نہ تھے مغرورائے دوست
جو خدا چاہے کرے بندہ ہے مجبورائے دوست

پاس اب سوتے ہیں جو دور پڑے رہتے تھے
بیٹھتے وہ ہیں برابر جو کھڑے رہتے تھے

گفتگو چھیڑ کی کرتے ہو سخن سازوں سے
پہروں غمازی رہا کرتی ہے غمازوں سے
حال دل کا ہے بیاں تفرقہ پردازوں سے
صحبت اب آن رہی ہے خلل اندازوں سے

فرق آیا تری باتوں میں خدا خیر کرے
تہ نکلنے لگی باتوں میں خدا خیر کرے

جو کڑی کہتے تھے ہم تم پر اُسے سہتے تھے
سخت کہتے تھے تو سن کر اُسے چپ رہتے تھے
رونے لگتے تھے نہ یوں پھوٹ نہ یوں بہتے تھے
اس مروّت پہ تمھاری یہی ہم کہتے تھے

اس پہ قربان رہیں گے اسے چاہیں گے ہم
منھ سے نکلا جو کچھ اسے نباہیں گے ہم

کوئی آ سکتا نہ تھا اپنے سوا صحبت میں
دوسرے کو نہ رسائی تھی تری خدمت میں
مختصر قِصہ ہمیں ہم تھے ہر اک حالت میں
انجمن میں ہمیں ہوتے تھے ہمیں خلوت میں

مصحف رخ کو سمجھتا نہ تھا ایماں کوئی
خال ہندو کا نہ عاشق تھا مسلماں کوئی

کیسی تدبیر تمھاری ہے یہ کیسی تجویز
نہ رہی آپ کو ہرگز کس و ناکس میں تمیز
چیز اب ان کو سمجھنے لگے جو تھے ناچیز
ہم سے دیکھا نہیں جاتا ہے ذلیلوں کو عزیز

ان سے نیکی کرو مجنوں جو بد افعال نہ ہوں
لوٹیں وہ دولتِ دیدار جو کچھ مال نہ ہوں

''عیش باغ'' آپ کبھی سیر کو جب جاتے تھے
خار ہوتا تھا جو بندے کو رواں پاتے تھے
غنچہ سا میری جدائی سے بہ تنگ آتے تھے
بھیج کر پیک صبا ڈھونڈھ کے بلواتے تھے

ہر روش پر مجھے تم ساتھ لیے پھرتے تھے
ہاتھ میں اپنے مرا ہاتھ لیے پھرتے تھے

شاذ تھا رنج مری جان' کدروت نادر
حال پر اپنے توجہ تھی تمھاری ظاہر
کبھی خدمت میں جو ہوتے نہ تھے چندے حاضر
منتیں مانتے پھرتے تھے ہماری خاطر

روشنی مسجدوں میں جا کے کیا کرتے تھے
چلّے درگاہوں میں دن رات بندھا کرتے تھے

روز وشب وہ جو رہا کرتی تھی صحبت نہ رہی
ہم نشینی کی جو خدمت تھی وہ خدمت نہ رہی
قصہ کوتاہ ہو وہ مہر و محبت نہ رہی
منھ دکھانے کو ہماری کوئی صحبت نہ رہی

التماس اتنا تو رکھتے ہیں تری ذات سے ہم
پھر گیا تو مگر اپنی نہ پھرے بات سے ہم

اٹھ گیا مہر ومحبت کا زمانے سے رواج
بیٹھے بیٹھے اس الجھ پڑنے کا کیا کیجیے علاج
یوں تو معشوقوں کا ہوتا ہے تلون کا مزاج
پر نہ اتنا بھی کہ کل تھی سو طبیعت نہیں آج

یا ہمیں ساتھ رہا کرتے تھے اندر باہر
یا ہمیں ہیں کہ ہمیں حکم ہے باہر باہر
یہی طرزیں ہیں جو صاحب کی، یہی ہیں انداز
ہم نے بھی عہد کیا دل سے بس اے بندہ نواز
کریں گھر کی طرف تیرے نہ کبھی روئے نیاز
اس طرف کعبہ بھی ہووے تو کریں ترک نماز
واں نکل جائیں جہاں کا نہ پتہ ملتا ہو
نہ ملیں ملنے سے تیرے جو خدا ملتا ہو
جانِ جاں دل کا جلانا نہ ہمیں آتا تھا
بگڑی صورت کا بنانا نہ ہمیں آتا تھا
خندہ زن ہو کے رلانا نہ ہمیں آتا تھا
منھ کو دکھلا کے چھپانا نہ ہمیں آتا تھا
گرہ ابرو میں نہ تھی کاکل پیچاں کی طرح
زلفوں کا رخ نہ پھرا رہتا تھا مژگاں کی طرح
خود فروشی کو مقید نہ تھے خودکامی کے
پختہ کامی کے چلن چلتے نہ تھے خامی کے
ہونٹ سلواتے تھے دم بازوں کے پیغامی کے
ننگ آتا تھا تمھیں نام سے بدنامی کے
پری و حور سے بھی حسن میں مغرور تھے تم
پاس تم کو نہ کسی کا تھا بہت دور تھے تم
سرمہ دیتے تھے تو آنکھوں کو چراتے تھے تم
پان کھاتے تھے تو منھ کو نہ دکھاتے تھے تم
مہندی ملتے تھے تو ہاتھوں کو چھپاتے تھے تم
پاؤں خلخال پہن کر نہ ہلاتے تھے تم

قتل سے عاشقِ صادق کے وفا مانع تھی
خونِ ناحق سے تمھیں شرم و حیا مانع تھی

جو خوشی خاطرِ نازک کی نہیں اس کا غم
کھایئے ترکِ محبت کی جو کھاتے ہو قسم
رہ نہیں سکنے کے بے شغل یہی کہتے ہیں ہم
ڈھونڈھ لیں گے کوئی زیبا صنمِ عیسیٰ دم

عشق بازی کا نہ بھولیں گے مزہ یاد رہے
دل لگا لیں گے ''فرنگی محل'' آباد رہے

یہ غلط فہمی ہے ہم سا کوئی محبوب نہیں
کیا کوئی اور زمانے میں خوش اسلوب نہیں
راست بازوں سے یہ ابرو کی کجی خوب نہیں
نہ سہی دوستی صاحب کو جو مطلوب نہیں

تم کو غیروں کی مدارات مبارک ہووے
ہم کو جس سے ہے ملاقات مبارک ہووے

ایسا شاہد ہے اب اللہ سے ہم کو مقصود
آشنائی جسے مقبول ہو رنجش مردود
سامنے اپنے تجھے کچھ نہ وہ سمجھے موجود
رخِ گلرنگ جو دکھلایئے تو بھیجے درود

نرگسِ چشم کا حیرت سے تماشائی ہو
سنبلیں زلفوں کی بو سونگھ تماشائی ہو

خوں کرے دل کو ہمارے رگِ جاں سے وہ کمر
حلقۂ ناف کی تنگی سے رہو تنگ اکثر
ہاتھ ملتے پھرو پاؤں پہ جو پڑ جائے نظر
چھلّے ہاتھ میں آئیں تو گل کھایا کرو چھاتی پر

لعل لب دیکھے تو سر پیٹے بہت ننگ سے تو
ہونٹ چاٹا کرے نامِ دہن تنگ سے تو

خوبی گوش کرے اپنا تمھیں حلقہ بگوش
پہروں ہی رکھے وہ گردن کی صراحی مدہوش
دیکھ کر آئینہ سا سینہ ہو حیرت سے خموش
حسن میں اُس کے غرض ہو نہ سکے دوش بدوش

نقشِ دل پر ترے نقش در دنداں سے رہے
خار خار آٹھ پہر کاوِش مژگاں سے رہے

مقر اس کا ہو وہ الزام تجھے جو جو دے
عرقِ شرم سے رخسار جبیں دھو دھو دے
خندہ زن ہو کے حقیقت کو نزی کھو کھو دے
آگے اس گل کے تو شبنم کی طرح رو رو دے

طعن و تشنیع وہی مہر لقا تجھ کو کرے
صورت ماہ نو انگشت نما تجھ کو کرے

طنز آمیز کلامات سے آگاہ کروں
چھیڑ کر باتیں بتاؤں اسے، تجھ سے سمجھوں
اس کی زلفوں کی طرح کان تک اس کے پہنچوں
جو فرشتے نے نہ پھونکے ہوں وہ اس کے پھونکوں

دل جلائے وہ ترا تجھ سے جگر جل نہ سکے
تجھ سے چل نکلے وہ تو اس سے مگر چل نہ سکے

راہ پر لاؤں اسے راہ بتاؤں تجھ کو
لب بہ لب اس سے رہوں منھ نہ لگاؤں تجھ کو
تنگ آغوش میں لوں اور دکھاؤں تجھ کو
جس طرح تو نے جلایا ہے جلاؤں تجھ کو

شا د ما ں نا زک ہو تجھے غم ہو و ے
میر ے گھر عید تر ے گھر محرم ہو و ے

گفتگو ا تنے لیے تھی یہ شکا یت آ میز
یا ر ی غیر سے تا آ پ کر وتم پر ہیز
نقص بیجا کے لیے میر ےلکھو د ستا و یز
متو جہ ہو اِ د ھر کو نگہِ لطف آ میز

پھر پر ی ہو و ہی تم ا و ر و ہی د یو ا نہ ہم
پھر و ہی شمع ہوتم ا و ر و ہی پر و ا نہ ہم

غیر معشو ق کا نکلا ہے ز با ں سے جو نا م
چھیڑ نے کے لیے صا حب کے فقط تھا یہ کلا م
حر فِ حق کہہ کے یہ وا سوخت کو کر تا ہے تما م
مت برا ما نیو اس با ت کا آ تش ہے غلا م

د وستی غیر سے و ا للہ جو منظو ر بھی ہو
آ نکھ اُ ٹھا کر نہ کبھی د یکھیں ا گر حو ر بھی ہو

خواجہ حیدر علی آتش کی ولادت فیض آباد میں 1778 میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس لیے آتش کی تعلیم و تربیت با قاعدہ طور پر نہ ہو سکی۔ آتش نے فیض آباد کے نواب محمد تقی خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ نواب مذاق سخن بھی رکھتے تھے اور فن سپاہ گری کے بھی دلدادہ تھے۔ آتش بھی ان کی شاعرانہ اور سپاہیانہ صلاحیتوں سے متاثر ہوئے۔ تقریباً انتیس سال کی عمر میں باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ لکھنوی ادب اور شاعری کے صحیح نمائندے آتش ہی تھے جس نے اردو غزل کو احساس کی زبان دی اور اس کے نگار خانے کو وسیع کیا۔ ان کے مخصوص لب و لہجے، رنگ و آہنگ، روحانی و نورانی شاعری میں جذب و سرور اور شوق و نشاط کی دوڑتی ہوئی لہریں، آج بھی انسان کو آدمیت کی شان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تلقین کر رہی ہیں۔ آتش کو اگرچہ بجا طور پر لکھنوی دبستان کا نمائندہ شاعر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوصف اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ صرف لکھنوی دبستان کے شاعر نہیں بلکہ دبستان دہلی اور لکھنؤ کے سنگم پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا ان کے یہاں لکھنویت کا رنگ اور دہلویت کی خوشبو دونوں نمایاں ہیں۔

خواجہ حیدر علی آتش پر یہ مونوگراف ڈاکٹر شرف النہار نے بڑی عرق ریزی سے تیار کیا ہے۔ شرف النہار فکشن، تحقیق و تنقید اور شاعری کے ذریعہ اردو ادب میں متعارف ہیں۔ ان کی دلچسپی کا موضوع 'اردو میں مراٹھی ادب کے تراجم' ہے۔ جس پر انہیں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ڈاکٹر شرف النہار کی تصنیفات میں پنڈت سدرشن کے منتخب افسانے، اردو افسانے میں حقیقت نگاری۔ ترقی پسند تحریک تک، بشر نواز کی شاعری اور نثری رنگ و شعری آہنگ وغیرہ شامل ہیں۔ درس و تدریس کے میدان میں نمایاں کارکردگی کے لیے متعدد انعامات سے سرفراز ہو چکی ہیں۔ آج کل ڈاکٹر رفیق ذکریا کالج فار ویمن، اورنگ آباد مہاراشٹر کے شعبہ اردو کی سربراہی کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ نیز Dr. BAMU کے کونسل برائے انتظامیہ کی ممبر اور اردو بورڈ آف اسٹڈیز کے عہدہ پر بھی فائز ہیں۔

ISBN: 978-93-87510-58-6

NCPUL
New Delhi

₹ 70/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی ۔ 110025

خواجہ حیدر علی آتش کی ولادت فیض آباد میں 1778 میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس لیے آتش کی تعلیم و تربیت با قاعدہ طور پر نہ ہو سکی۔ آتش نے فیض آباد کے نواب محمد تقی خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ نواب مذاق سخن بھی رکھتے تھے اور فن سپاہ گری کے بھی دلدادہ تھے۔ آتش بھی ان کی شاعرانہ اور سپاہیانہ صلاحیتوں سے متاثر ہوئے۔ تقریباً انتیس سال کی عمر میں با قاعدہ شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ لکھنوی ادب اور شاعری کے صحیح نمائندے آتش ہی تھے جس نے اردو غزل کو احساس کی زبان دی اور اس کے نگار خانے کو وسیع کیا۔ ان کے مخصوص لب و لہجے، رنگ و آہنگ، روحانی و نورانی شاعری میں جذب و سرور اور شوق و نشاط کی دوڑتی ہوئی لہریں، آج بھی انسان کو آدمیت کی شان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تلقین کر رہی ہیں۔ آتش کو اگرچہ بجا طور پر لکھنوی دبستان کا نمائندہ شاعر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوصف اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ صرف لکھنوی دبستان کے شاعر نہیں بلکہ دبستان دہلی اور لکھنؤ کے سنگم پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا ان کے یہاں لکھنویت کا رنگ اور دہلویت کی خوشبو دونوں نمایاں ہیں۔

خواجہ حیدر علی آتش پر یہ مونوگراف ڈاکٹر شرف النہار نے بڑی عرق ریزی سے تیار کیا ہے۔ شرف النہار فکشن، تحقیق و تنقید اور شاعری کے ذریعہ اردو ادب میں متعارف ہیں۔ ان کی دلچسپی کا موضوع 'اردو میں مراٹھی ادب کے تراجم' ہے۔ جس پر انہیں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ڈاکٹر شرف النہار کی تصنیفات میں پنڈت سدرشن کے منتخب افسانے، اردو افسانے میں حقیقت نگاری۔ ترقی پسند تحریک تک، بشر نواز کی شاعری اور نثری رنگ و شعری آہنگ وغیرہ شامل ہیں۔ درس و تدریس کے میدان میں نمایاں کارکردگی کے لیے متعدد انعامات سے سرفراز ہو چکی ہیں۔ آج کل ڈاکٹر رفیق ذکریا کالج فار ویمن، اورنگ آباد مہاراشٹر کے شعبہ اردو کی سربراہی کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ نیز Dr. BAMU کے کونسل برائے انتظامیہ کی ممبر اور اردو بورڈ آف اسٹیڈیز کے عہدہ پر بھی فائز ہیں۔

ISBN: 978-93-87510-58-6

NCPUL
New Delhi

₹ 70/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025